دستکِ درِ مُقفّل

منتخب کالموں کا مجموعہ

کنیز بتول کھوکھر

کنیز بتول کھوکھر ــــ ایک تعارف!

محترمہ کنیز بتول کھوکھر سرگودھا کے ایک درس و تدریس سے وابستہ متمول، تعلیم یافتہ اور زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔آپ سرگودھا کی تحصیل ساہی وال کے نواحی گاؤں نوشہرہ کھوکھراں میں پیدا ہوئیں۔آپ کے والد حاجی محمد علی علاقے کے مشہور زمیندار تھے۔آپ کا بچپن اسی گاؤں میں گزرا لیکن ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ کو سرگودھا شہر میں موجود خاندانی رہائش گاہ پر بھجوا دیا گیا۔یہاں آپ نے گورنمنٹ ایم سی گرلز ہائی سکول 26/27 بلاک سے 1996ء میں میٹرک پاس کیا۔ جب کہ ایف اے 1998ء میں گورنمنٹ کالج برائے خواتین سرگودھا سے پاس کیا۔ 2001ء میں پنجاب یونیورسٹی سے گریجوایشن کرنے کے بعد ماسٹر ڈگری حاصل کرنے کیلئے پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے منسلک ہو گئیں۔اردو کی ماسٹر ڈگری انہوں نے 2005ء میں حاصل کی۔

ابتدا ہی سے درس و تدریس اور ادبی سرگرمیوں سے خصوصی دلچسپی اور لگاؤ کی وجہ سے محترمہ کنیز بتول نے پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستگی کے دوران اسلام آباد سے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں بی ایڈ میں داخلہ لے لیا۔اس امتحان میں آپ نے 2005ء میں کامیابی حاصل کی۔

عمومی تعلیم کے ساتھ ساتھ انہوں نے مختلف فنون میں مہارت حاصل کی تا کہ علاقے اور گردونواح کی لڑکیوں اور خواتین کو ہنر مند اور خود کفیل بنایا جاسکے انہوں نے اپنے گاؤں میں ووکیشنل ٹرینگ انسٹی ٹیوٹ میں ایک سال کے تربیتی پروگرام کی جامع اور ٹھوس منصوبہ بندی کی۔ جہاں انہیں نے امورِ خانہ داری، ملبوسات کی سلائی، کٹائی اور ڈیزائینگ، کشیدہ کاری کے علاوہ شجر کاری اور باغبانی کی تربیت دی جاتی تھی

محترمہ کنیز بتول نے درس و تدریس میں اپنے کیریئر کا آغاز اپریل 2005ء علی سکول آف آرٹس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دستکِ درِ مقفّل

کنیز بتول کھوکھر



کتاب ہمراز ہے

ISBN
9 789697 430161 >

اُردو سخن

◆ یہ کتاب کنیز بتول کھوکھر کے ایما پر شائع کی گئی ہے اور اس کے جملہ حقوق اور متن کی تمام تر ذمہ داری انہی کو مستحسن ہے۔ ادارہ اردو سخن ڈاٹ کام کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ قارئین تک بہترین اور اغلاط سے پاک ادبی مواد پہنچایا جائے اور اس ضمن میں ہر امکانی کوشش کو بروئے کار لایا جاتا ہے تاہم غلطی کی نشاندہی کا خیر مقدم کیا جاتا ہے تاکہ آئندہ اشاعت میں اس کی درستی کی جائے۔ (ادارہ)

منتخب کالموں کا مجموعہ

دستکِ درِ مُقفّل

کنیز بتول کھوکھر

اُردو سخن پاکستان

آرٹ لینڈ، اردو بازار چوک اعظم (لیہ) فون:0302-7844094
اسٹاکسٹ: فائن پبلی کیشنز، آفس 16، II۔سیکنڈ فلور ڈیوس ہائٹس، ڈیوس روڈ لاہور

کنیز بتول کھوکھر

96- Saleem Park,
Sargodha (Punjab). Pakistan

www.facebook.com/kaneez.battol
kbattolmalik@gmail.com
Socialite TV

ناشر: اردو سخن ڈاٹ کام، پاکستان

نمودِ اول: 2020ء

نظرِ ثانی: ——— ممتاز عارف
تزئین: ——— ارشد علی کھوکھر
قانونی مشیر: ——— میاں احمد نواز (ایل ایل ایم)
ایڈووکیٹ ہائی کورٹ پنجاب، لاہور
مطبع: ——— شیر ربانی پرنٹرز، ملتان
قیمت: ——— 400 روپے (30 یورو، 40 ڈالر)

اردو سخن

آرٹ لینڈ، گرلز کالج روڈ، اردو بازار چوک اعظم (لیہ) فون: 0302-7844094
اسٹاکسٹ: فائن پبلی کیشنز، آفس 16، II۔سیکنڈ فلور ڈیوس ہائٹس، ڈیوس روڈ لاہور
urdusukhan@urdusukhan.com
www.urdusukhan.com

اِنتساب

اور

کے نام!

فہرست مضامین

کنیزہ بتول کھوکھر

گذشتہ چند دہائیوں سے ہمیں اپنی معاشرتی اقدار میں نمایاں طور پر ایسی تبدیلیاں دیکھنے میں آئی ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ایک زمانہ تھا جب مفاد پرستی اور موقع پرستی گالی تصور کی جاتی تھی جبکہ آج موقع سے فائدہ نہ اٹھانے والا احمق تصور کیا جانے لگا ہے۔موقع سے فائدہ اٹھانے والا شخص اخلاقیات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس کی ہر قیمت ادا کرنے کو تیار بیٹھا ہے۔علم الانسان کی لغت میں ایسے الفاظ کا تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے جنہیں قبل ازیں سات تہوں میں چھپا کر رکھا جاتا رہا۔جیسے جھوٹ، غلط بیانی، ملمع کاری، دکھاوا، کردار کشی، الزام تراشی، تہمت، ملاوٹ، ہیرا پھیری، کم تولنا، دھوکہ دہی، غیر معیاری اشیاء اور ادویات کی تیاری و فروخت، آنکھوں میں دھول جھونکنا، رقم یا قیمتی اشیاء ہتھیانا وغیرہ وغیرہ۔

جب ہم نے شعور کی عمر میں پہلا قدم رکھا تو ہمیں آس پاس کے ماحول میں جو دیکھنے کو ملا، وہ تھا 'قول و فعل میں بھرپور تضاد'......اس سے قبل جس نکتے پر بات کرنا بے حد اہم ہے، وہ ہماری روزمرہ کی عام گفتگو میں لفظوں کا چناؤ ہے۔اکثر مشاہدے میں آتا ہے کہ ہم اپنا مطمعٔ نظر بیان کرتے وقت ایسے الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں جن کا مطلب دراصل وہ ہوتا ہی نہیں، جو ہم تصور کیے ہوتے ہیں۔اس کے بعد ہمارا جارحانہ لہجہ اپنا بھرپور کردار ادا کرتا ہے۔اس طرح ہر شخص کا اختلافِ رائے اُس کو اپنے ہی دائرے تک محدود کر دیتا ہے اور ایک مہذب، مثالی اور صحت مند معاشرے کا بنیادی ڈھانچہ شکست و ریخت کا شکار ہو کر بکھر جاتا ہے۔اس انفرادی سوچ اور ذاتی مفاد کی وجہ سے معاشرہ گروہی مفادات کا شکار ہو کر اپنی پہچان کھو دیتا ہے۔

معاشرے کی ان ناہمواریوں میں اضافہ جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو پھر اس کو سدھارنا بہت

ضروری ہو جاتا ہے۔ معاشرے کا سدھار یقینی طور پر مدبر اور حساس لوگوں کی اہم ذمہ داری ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی کوئی قوم بگڑی، اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے مخصوص بندوں کا انتخاب کر کے انہیں یہ ذمہ داری سونپ دیتے کہ اپنی قوم وقبیلہ کو صراطِ مستقیم دکھائیں۔ یہ منتخب بندے اس زمانے کے صابر اور شاکر ہونے کے ساتھ مخلوقِ خدا کی محبت کیلئے نرم گوشہ بھی رکھتے۔ تمام ادوار میں معاشرتی علوم میں دلچسپی رکھنے والے لوگ اپنا بھرپور کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ انسان جب علم کی تلاش میں نکلتا ہے تو سب سے پہلے اس کی نظر زمانے اور معاشرے کے نشیب وفراز پر ہی پڑتی ہے۔ انہی ناہمواریوں کے نتیجے میں جب کوئی ناخوشگوار حادثہ نمودار ہو تو ذرائع ابلاغ سے مثبت اور ذمہ دار رویہ اختیار کرنے کی توقع رکھنا معاشرے کا بنیادی حق ہے لیکن ذرائع ابلاغ میں مفاد پرست ''گھس بیٹھے'' عناصر جب بغیر تحقیق کے خبر کی نشر واشاعت، اپنی ریٹنگ کیلئے اس میں سنسنی خیزی کا عنصر شامل کرنے، گھما پھرا کر معمولی سی بات کو طوالت دینے، کہ یہی خبر اہم سمجھی جائے، دوسروں کی عزت اچھالنے، نتائج کی پروا کیے بغیر ذاتی مفاد کی خاطر مجرمانہ طور پر حقائق کو چھپانے اور جھوٹ کو پھیلانے میں پیش پیش ہوں تو معاشرے کی روح چھلنی ہو جاتی ہے۔ واضح رہے کہ جھوٹ بولنے اور جھوٹ پھیلانے کا عمل دنیا کے ہر معاشرے میں ناپسندیدہ فعل تصور کیا جاتا ہے۔

نبی پاکؐ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ مجرمانہ غلط بیانی سے انصاف میں رکاوٹ آنا یقینی امر ہے۔ جو واقعات رپورٹ کیے جاتے ہیں، ان میں لفظوں کا محتاط چناؤ تو ایک طرف، ظلم وتشدد اور اخلاق باختہ مناظر جنہیں سکرین پر دکھانے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی، نشر کرتے ہوئے خبردار کیا جاتا ہے کہ ''بچے اور کمزور دل خواتین وحضرات اسے نہ دیکھیں'' ...... یہ انسانی نفسیات ہے کہ اس طرح تجسس پیدا ہوتا ہے۔ لوگ بچنا بھی چاہیں تو اسے ضرور دیکھیں گے۔ معلوم نہیں کہ مضبوط دل والوں کو اس سے کیا پیغام دیا جاتا ہے؟ اس طرح کی خبریں معاشرے پر انمٹ نقوش چھوڑتی ہیں۔

معاشرے کے حوادث میں چھلنی ہونے والے کرداروں کو جب ذرائع ابلاغ کے نام نہاد مفاد پرستوں کی بھینٹ چڑھتے دیکھا تو میرا دل خون کے آنسو رویا اور میں نے ان واقعات کو علامتی انداز میں ضبطِ تحریر میں لانے کی ٹھان لی۔ قلم سنبھالا تو موضوعات کا ایک انبار سامنے تھا۔ لکھتے

ہوئے مجھ پہ آشکار ہوا کہ اچھائی دب کر رہ گئی ہے اور برائی کو جیسے پَر لگ گئے ہوں۔ شہرت کے متمنی آسان رستے کی تلاش میں ہیں اور عام لوگ بنا قابلیت اونچے رتبوں کے خواہش مند۔ ہر شخص خود ساختہ مسائل میں اس قدر الجھا ہے کہ دوسروں کی پروا تک نہیں ہے۔ اب شخصی آزادی کا نیا مفہوم متعارف کرایا گیا ہے کہ ''کوئی بھی شخص کسی کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی سے باز رہے''۔ اگر کسی کا غلط فعل یا عمل معاشرتی برائیوں میں اضافے کا سبب بنتا ہے تو اسے روکنا ضروری کیوں نہیں؟...... اگر نہ روکا گیا تو یہ برائی معاشرے میں وبائی مرض کی طرح پھیل جائے گی۔ اس قسم کی برائیوں میں بغض، غیبت، بہتان، جاسوسی، احساسِ کمتری، غصہ، حسد، اضطراب، بے بسی، مال و دولت کی ہوس، غم و رنج، بھوک، ڈر، خوف، بزدلی، سستی، کاہلی اور پست خیالی شامل ہیں۔ ان جملہ مسائل سے نجات کا مؤثر حل تلاش کرنا ضروری ہے خواہ ان کا محرک معاشی ہو یا سیاسی، سماجی، مذہبی، تعلیمی و معاشرتی یہ اس حد تک شدت اختیار کر چکے ہیں کہ ان سے فرار عام آدمی کیلئے ممکن نہیں۔ حالات پیچیدہ ہو جائیں تو آپ اپنا انفرادی وجود برقرار نہیں رکھ سکتے۔

ان نفسیاتی مسائل سے محفوظ رہنے کے لیے جسمانی صحت کے ساتھ قلب و روح کی پاکیزگی، ذہن کی طہارت و لطافت، ارادوں میں پختگی اور کردار کی عظمت و بلندی بہت اہم ہیں۔ معاشرے میں بیشتر بیماریاں ان رویوں کے فقدان سے ہیں لیکن اس کا ہمیں ادراک بالکل نہیں۔

دراصل اپنی انہی تحریروں کے ذریعے میں نے معاشرے کے بند کواڑوں پر امید سے بھرپور دستک دینے کی جستجو کی ہے جن پر عرصہ دراز سے قفل پڑے ہیں اور ہم ان کی مخصوص کلید سے کھولنے میں ناکام رہے ہیں کہ اس پر شخصی انا کا تہہ در تہہ زنگ موجود ہے۔ انہیں کھولنے اور فعال بنانے کے لیے ذہنی، روحانی، قلبی اور جسمانی بالیدگی کی اشد ضرورت ہے۔ آپ کے ہاتھوں میں موجود یہ کتاب گذشتہ تین چار برسوں کے دورانیے میں لکھی جانے والی تحریروں پر مشتمل ہے جو کالموں کی صورت میں ملک کے مختلف قومی اخبارات کی زینت بنیں۔

میں اپنی اس جدوجہد میں کس حد تک کامیاب ہو سکی ہوں اس کا فیصلہ قارئین بہترین طور پر کر سکتے ہیں۔

دستک درِ مُقفّل

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

محترمہ کنیز بتول گوناگوں صلاحیتوں کی مالک ہیں۔ بی۔اے اور ایم۔اے (اُردو) کے چار برسوں کے دورانئے میں اُس کی مخفی صلاحیتوں کا اتنا ادراک نہ تھا جتنا کنیز بتول نے کر دکھایا۔ کنیز بتول نے اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا مظاہرہ کیا ہے۔ اُس نے کانچ کی چوڑیاں پہنے ہوئے حالات کی سنگینی کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ پا بہ زنجیر حالات یا آگہی کے عذاب سے دوچار کنیز بتول نے آواز کے رشتوں سے تخلیقی مواد حاصل کیا۔ اس نے حصارِ ذات میں مقید لمحۂ موجود کے تمام نوحے اپنی سماعتوں میں محسوس کرنے کے باوجود آگے قدم بڑھائے۔ کنیز بتول میں نہ صرف دینی تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ موجود ہے بلکہ وہ دینِ متین کی تبلیغ کا فریضہ بھی انجام دے رہی ہے۔ مشرقی اور شرعی لباس میں ملبوس وہ خواتین وحضرات کو طبِ اسلامی سے روشناس کروا رہی ہے۔ ادویات کے چنگل میں گھرے مریضوں کو نویدِ صحت دے رہی ہے۔ وہ ریڈیو پاکستان کے پروگراموں میں بھی دلچسپی سے حصہ لیتی ہے۔ اس نے آن لائن تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا ہے۔ وہ روشن مستقبل کے خواب چلمنوں کی اوٹ سے دیکھتی ہے اور خوابوں کی تعبیر کے لیے سخت جدوجہد کرتی ہے اور منتشر لفظوں کو شعری سانچے میں ڈھالنے کا تجربہ بطریقِ احسن کرتی ہے کہ اُس کی دھڑکنوں اور بے ترتیب بیتے لمحوں کی آواز اُس کے شعروں میں محسوس ہوتی ہے۔ وہ ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر تھکا دینے والی ہواؤں کا رخ بدلنے کے لیے برسرِ عمل ہے۔ اُس نے اپنے جذبات کو شعری سانچے کے علاوہ نثری کینوس پر بھی منتقل کیا ہے۔ ''دستک درِ مقفّل'' اُس کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین سماجی، اخلاقی، صحافتی اور تجرباتی ہیں۔ مختلف اخبارات میں شائع ہونے والے کالموں کا مجموعہ'' دستک درِ مقفّل'' وقت کی آواز ہیں۔ ''دستک درِ مقفّل'' تک رسائی کرتے ہوئے یہ بتانا ضروری ہے کہ مضمون کا لفظ انگریزی (Essay) کا مترادف ہے۔ یہ لفظ ہر زبان میں بڑے وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہی

حال اردو زبان کا بھی ہے۔ اس کے دائرہ کار میں علمی، مذہبی، نفسیاتی، عمرانی، تاریخی، سائنسی غرض دنیا کا ہر ایک موضوع آ جاتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے ہم اس تحریر کو مضمون کہتے ہیں جس میں کسی متعین موضوع پر اپنے خیالات و احساسات کا اظہار کیا گیا ہو۔ اس تعریف میں اگر اس بات کا بھی اضافہ کر دیا جائے کہ جو تحریر خواہ کسی بھی موضوع پر ہو، اگر اپنے اندر ادبیت کی خوبی رکھتی ہے، مضمون کہلائے گی۔ یہ اس کی بڑی حد تک موزوں تعریف ہوگی۔

مضمون کو اس تعریف کی روشنی میں دیکھیں تو اردو میں اس کی ابتدا سر سید احمد خان سے ہوتی ہے۔ انہوں نے لندن سے واپسی پر رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' نکالا اور اس میں انگریزی رسائل ٹیٹلر اور سپیکٹیٹر کی طرز پر مضامین چھاپنا شروع کیے۔ سر سید کے علاوہ محسن الملک، وقار الملک، مولوی چراغ علی، ذکاء اللہ، مشتاق حسین اور الطاف حسین حالیؔ نے بھی تہذیب الاخلاق میں بڑے بلند پایہ مضامین تحریر کیے۔ ان میں مذہب، اخلاق، سیاست اور سائنس سے لے کر سنجیدہ اور ہلکے پھلکے ہر قسم کے موضوعات کو لیا گیا تھا۔ مولانا محمد حسین آزادؔ، شبلی نعمانیؔ اور مولوی نذیر احمد نے بھی اس زمانے میں مختلف موضوعات پر خوب صورت مضامین لکھے۔ مولانا شبلی کے مضامین تو کئی جلدوں میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔

ان کے بعد مولانا عبدالحلیم شررؔ، خواجہ حسن نظامیؔ، سید سلیمان ندویؔ، رشید احمد صدیقیؔ، مولوی عبدالحق، سر عبدالقادرؔ، مولانا ابوالکلام آزادؔ، خلیق دہلویؔ، میاں بشیر احمد، عبدالعزیز فلک پیماؔ، مہدی افادیؔ، مولانا صلاح الدین احمدؔ، عبدالماجد دریا آبادیؔ اور نیازؔ فتح پوری نے بھی بعض بہت اچھے مضامین لکھے۔ دورِ حاضر میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؔ، رضیؔ الدین صدیقی، مناظر احسنؔ گیلانی، رشید ترابیؔ اور مولانا علی نقی نے مذہب اور فلسفہ کے موضوع پر اعلیٰ پایہ کے مضامین تحریر کیے ہیں۔

مختار مسعود نے ''آوازِ دوستؔ'' کے مضامین سے بڑی شہرت پائی ہے۔ یہ مضامین اس صنفِ ادب میں بلاشبہ ایک وقیع اضافہ ہیں۔ علی عباس جلال پوریؔ اور عزیز ملکؔ کے مضامین بالترتیب فلسفے اور مذہب پر یادگار تحریریں ہیں۔ سائنس کے موضوع پر پروفیسر حسن عسکری کے مضامین کی بھی خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس طرح ڈاکٹر محمد اجملؔ کے نفسیات پر، پروفیسر کرارؔ حسین کے پاکستانی ثقافت پر اور ڈاکٹر صفدر محمودؔ کے تحریک پاکستان پر مضامین بھی ادبی شان کے مالک ہیں۔

کنیز بتولؔ ادبی دنیا میں نو آموز ہیں۔ تا دمِ تحریر (۵ فروری ۲۰۲۰ء) اُس نے کئی مقامی اور

قومی اخبارات میں بہت کچھ لکھا ہے۔ معروف صحافی سید غضنفر کاظمی نے کنیز بتول کی تحریروں کے بارے میں خوب لکھا ہے: ''ہر مخلوق کی تخلیق کا ایک مقصد ہے۔ ہر مخلوق کے ذمہ ایک کام ہے۔ جب وہ کام ہو جائے تو مخلوق کی عمر تمام ہو کر واپس اپنے خالق کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ اس انداز میں دیکھیں تو شاید کنیز بتول کی تخلیق کا مقصد ان کی تحریروں کے ذریعے فلاحِ انسانیت ہے۔ اگر ایسا ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ کنیز بتول کھوکھر اس فرض کو بطریقِ احسن انجام دے رہی ہیں۔''

ان کے مضامین کی سب سے بڑی انفرادیت یہ ہے کہ وہ مقصدیت کے گرد گھومتے ہیں۔ اُنھوں نے مقصدیت کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ کئی مضامین کا آغاز افسانوی ہے اور کنیز بتول نے تشبیب کا انداز اپنا کر اپنی منزل تک رسائی حاصل کی ہے۔ اُن کے مضامین نہ صرف اُن کی سوچ کے دھارے کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ اُن کے کشید کردہ تجربات کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اس نے سادہ لفظوں میں گہری باتیں کہہ کر سہلِ ممتنع کا مظاہرہ کیا ہے۔ بعض مقامات پر کلمۂ حق بلند کرنے میں کسی طرح بھی خوف وخطر کا مظاہرہ نہیں کیا۔ قلم سے جہاد کی ایسی مثالیں نسلِ نو کے جذبات کی آئینہ ہیں کہ ان کے جواہر ملّی و قومی جذبوں کی بخوبی نمائندگی کرتے ہیں۔ ''احساسِ ذمہ داری'' کا افسانوی آغاز ملاحظہ ہو:

''سورج غروب ہونے سے قبل آسمان پر پھیلی سرخی یوں تھی جیسے حجلۂ عروسی میں بیٹھی دلہن شرما رہی ہو۔ پرندوں کی قطاروں کا مغرب کی طرف سفر اس یقین کو پختہ کر رہا تھا کہ یہ سفر کسی حسینہ کے شوقِ دیدار میں ہو رہا ہے۔ دن بھر کے تھکے انسان اپنے کام نمٹا کر منزلوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ علی کا باپ اپنے گھر قدم رکھتے ہی کندھوں پر لدی چارے کی گٹھڑی ایسے زمین پر پھینکتا ہے جیسے اپنی ہی نعش کو کندھوں پر اٹھائے ایک طویل مسافت سے واپس ہوا ہو اور اس پر قیامت یہ کہ کوئی پرسہ دینے والا بھی نہیں۔''

کنیز بتول نے اپنے تجزیے کے مطابق اس بحث کو مختصر لفظوں میں سمیٹا ہے کہ انڈے سے مرغی ہے یا مرغی سے انڈا؟ اُنھوں نے ارتقائی سفر کو ''گھر ہونے تک'' خوب صورت انداز میں پیش کر دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

''انڈے سے مرغی تک'' مسخروں کا ٹولا جہاں کہیں نظر آئے گا، موضوعِ بحث ان کا انڈا اور مرغی ہوگا۔ ان کی بے نیازی کا یہ عالم کہ خود نہیں جانتے جو بول رہے ہیں، وہ تنقید ہے طنز، فضول الکلامی یا

ان کی ضرورت۔ توانائی حاصل کرنے کے لیے جس کو شرطِ زندگی سمجھ کر آغازِ صبح کرتے ہیں اسے حقیر سمجھ کر مذاق اڑانے والے اپنے منہ پر آپ تھپڑ مارتے ہیں کیونکہ اپنی ضرورت نظر نہیں آتی۔ صرف حجم یا قیمت سے اہمیت کا اندازہ لگاتے ہیں۔ کوئی بھی چیز کارخانۂ قدرت میں چھوٹی یا بے فائدہ نہیں ہوتی۔ ہم اپنے اردگرد کا جائزہ لیں تو کتنی ایسی اشیا ہوں گی جن کی اہمیت سے ہم ناواقف ہیں مثلاً سوئی کو اپنی زندگی سے نکال کر دیکھیں، تب اس کی اہمیت و کردار کا اندازہ ہوگا۔ بنیادی ضروریات میں سے دوسری لباس ہے۔ وہ اس معمولی سی چیز کے مرہونِ منت ہے۔ اس کا کام کوئی مہنگی سے مہنگی شے نہیں کر سکتی۔ پھر وقعت کا ادراک ہوتا ہے۔ جاندار مخلوق کے زندہ رہنے کے لیے سب سے لازمی خوراک ہوتی ہے۔ اس کا وجود رہے گا تو باقی ضروریات محسوس کی جائیں گی۔ ہمارے ملک کی پچھتر فی صد آبادی گاؤں میں رہتی ہے۔ آج بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جنھوں نے شہر نہیں دیکھا۔ ان لوگوں کی زندگیوں پر موٹروے اور میٹرو کا کتنا اثر ہوگا؟ لیکن خوراک ہر انسان کی ضرورت ہے۔ گاؤں ہو یا شہر۔ جان ہے تو جہان ہے۔ عصری تقاضوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے اب ہمیں شعوری فیصلے کرنا ہوں گے۔ مہنگائی کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اشکوں کی برسات کو روکنا ضروری ہوگیا ہے تاکہ غریب کو دو وقت کا کھانا آسانی سے میسر آسکے۔"

کنیز بتول نے اپنے زاویۂ ہائے نگاہِ مذکورہ مضامین میں قرآنی آیات، فرمودات اور اشعار کا سہارا لے کر منفرد انداز اپنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اِن مضامین کے عمیق مطالعہ سے آپ کو بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ مصنفہ میں افسانہ لکھنے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔ زندگی کی دھوپ چھاؤں میں تخلیق کیلئے کوئی مخصوص موسم نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ کنیز بتول کے مضامین میں سارے موسم محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ اُس کے مشاہدات تخلیقی تاج محل کی راہداریوں سے ہو کر گزرتے ہیں۔ اُس کے مضامین میں حالات کی وسعتیں سمٹ کر یکجا ہو چکی ہیں۔ خارزارِ ادب میں کنیز بتول کا ابھی آغاز ہے۔ اُسے آگے بڑھنا ہے۔ اُس کے قلم میں قوت اور ذہن میں ہزاروں خیالات مجتمع ہیں۔ وقت، ایک ضدی بچے کی طرح اٹکھیلیاں کرتا رہتا ہے۔ کنیز بتول وقت کی روح قرطاس و قلم کے سپرد کرتی رہے گی۔ میں کنیز بتول کی تمام تر کامیابیوں اور کامرانیوں کے لیے دُعا گو ہوں۔

خاموش گفتگو

سید غضنفر آغا کاظمی

کنیز بتول کی قلمی کاوشوں کا مستقل عنوان ''خاموش گفتگو'' بظاہر مہمل محسوس ہوتا ہے کیونکہ یہ آفاقی اصول ہے کہ اگر خاموشی ہوگی تو گفتگو نہیں ہوگی اور اگر کہیں گفتگو ہوگی تو پھر خاموشی ناپید ہوگی۔ لیکن خاموشی اور بات چیت دونوں اکٹھے کہیں نظر نہیں آتے۔ یہ عمومی سوچ ہے لیکن اس عنوان کو ایک اور نظر سے دیکھتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ خاموش گفتگو انتہائی مقدس عمل ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں اپنی قوتِ پرواز کو ماضی میں دھکیلنا ہوگا۔ آئیں میرے ساتھ اپنی قوتِ پرواز کو آزمائیں اور ہم اس وقت میں جاتے ہیں جب سورج، چاند، ستارے، زمین، آسمان حتیٰ کہ ابھی وقت بھی خلق نہیں ہوا تھا۔ ویسے بھی قرآن مجید میں ہے اور نہج البلاغہ میں بھی کہ کائنات چھ دن میں تخلیق کی گئی۔ پہلے دن زمین کا فرش بچھایا گیا۔ دوسرے دن اس میں پانی کے سمندر بنائے گئے اور اس میں پانی کو اس انداز میں پلٹا گیا کہ اوپر کا پانی نیچے اور نیچے کا اوپر ہو گیا، اس عمل سے جو جھاگ پیدا ہوئی اس سے آسمان خلق ہوا۔ اگلے روز آسمان کو سورج، چاند اور ستاروں سے منزہ کیا گیا۔ اب ذہن میں سوال آتا ہے کہ جب سورج چوتھے روز خلق ہوا اور سورج کے گرد زمین اور سیاروں کی حرکت سے وقت شروع ہوا تو پھر سورج کی خلقت سے پہلے کے دن کہاں سے آئے؟ ان دنوں کا پیمانہ کیا تھا؟ یہ ایک الگ موضوع ہے۔ فی الحال مسئلہ ہے 'خاموش گفتگو' کا...... تو جب کچھ نہ تھا، صرف خدا کی ذات تھی یا یوں کہہ لیں کہ اللہ علم یعنی اس کے سوا کچھ نہ تھا...... اب بات آگے بڑھانے سے قبل ہم اس حدیث کو ذہن میں لاتے ہیں کہ: اوّلُ ماخَلَقَ اللہُ نوری۔ یعنی اللہ نے سب سے پہلے میرا نور خلق کیا۔ یہاں پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ نے کس شے سے حضور پاکؐ کا نور تخلیق کیا؟ کیونکہ جس چیز سے تخلیق ہوئی، اس کا وجود پہلے ہوگا۔ حضورؐ کی شخصیت اس شے کے بعد یعنی پھر وہ اول نہیں ہوں گے اور جب حضورؐ نے فرمادیا کہ وہ اول تخلیق ہیں تو اس کا

مطلب یہی ہے کہ وہی اول ہیں اور اس اول سے پہلے صرف خالق کی ذات ہے اور کچھ نہیں۔ اب اگر سوچا جائے کہ کسی شے کے بغیر یہ کیسے خلق ہوئے تو اس کے لیے ہمیں دنیا میں دیکھنا ہوگا کہ کیا کائنات میں کوئی ایسی چیز موجود ہے جو صفاتِ الٰہی کی حامل ہو۔

جب ہماری سوچ کا پنچھی اس تلاش میں محوِ پرواز ہوتا ہے تو ہمیں علم اللہ کی ایسی تخلیق نظر آتی ہے جو اعلیٰ صفات کی حامل ہے۔ یعنی علم ازل سے ہے۔ جب نیوٹن نے کششِ ثقل دریافت کی، یہ کشش اسی وقت پیدا نہیں ہوئی تھی بلکہ ازل سے تھی۔ زمین اپنی کشش کے ساتھ خلق کی گئی تھی۔ پھر نیوٹن نے درخت سے ایک پھل ٹوٹ کر زمین پر گرتے دیکھا تو اسے اپنا علم نہیں بنالیا کہ بلندی سے کوئی چیز اگر گرے تو دائیں بائیں یا اوپر نہیں جاتی بلکہ زمین پر گرتی ہے۔ بات وہیں ختم نہیں ہوئی۔ نیوٹن نے اس پر تفکر کیا اور سوالات پیدا کیے۔ پھر وہ کششِ ثقل تک پہنچے اور یہ علم آئندہ نسل کے لیے علم نہیں بلکہ علم حاصل کرنے کا مواد بنا۔ انہوں نے تفکر کیا اور سوالات کر کے اس نتیجے پر پہنچے کہ صرف کششِ ثقل ہی نہیں بلکہ ہوا کا دباؤ بھی ہے جو ہمیں زمین کے ساتھ چپکائے رکھتا ہے۔ پھر آنے والی نسلوں نے اس پر تفکر کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ کشش ثقل اور ہوا کا دباؤ صرف سات میل بلندی تک ہی ہے۔ اس کے اوپر نہ تو ہوا کا دباؤ ہے اور نہ ہی کشش ثقل۔ اس لیے خلا میں جو چیز بھی ہوگی، وہ پرواز میں رہے گی۔

اس بحث سے ثابت ہوا کہ علم کی کوئی حد نہیں۔ اس پر جتنا تفکر کیا جائے، مزید نئی تشریحات سامنے آتی جائیں گی۔ یہ اللہ کی ایک صفت ہے۔ اسمائے گرامی ایسی صفات پر ہیں کہ کسی ایک اسمِ گرامی کا ورد شروع کریں، اس کے اپنے اثرات ہوں گے۔ کسی دوسرے اسم کا ورد کریں، اس کے الگ اثرات ہوں گے۔ نام تو ایک ہی ہستی کے ہیں۔ یہ سوال صوفیاء کرام کے لیے چھوڑ دیتے ہیں اور ہم اپنے اصل نکتے پر آتے ہیں کہ نورِ الٰہی نے خود جو وسعت دی، اس سے جو اضافی نور پیدا ہوا اللہ نے اس کا نام محمدؐ طے کرلیا۔ پھر ان دونوں انوار میں بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ ٹیلی پیتھی کی طرز پر ہوئی اور اسی گفتگو کو 'خاموش گفتگو' کہا جاسکتا ہے۔ اس لحاظ سے کنیز بتول کھوکھر نے اپنی تصنیف کا جو عنوان تجویز کیا، وہ خود اپنے جلو میں اتنے مطالب کا حامل ہے اور اگر صرف اس کی تشریح کی جائے تو عمر بیت جائے، رجسٹروں کے رجسٹر ختم ہوجائیں لیکن تشریح پھر بھی نقطۂ تکمیل تک نہ پہنچ پائے۔

یہ تو بات ہوئی کتاب کے عنوان کی اب آیئے کتاب کی جانب سچ تو یہ ہے کہ میں اپنی علالت کے سبب پوری کتاب کا مطالعہ نہیں کر سکا لیکن ماہر باورچی دیگ کا ایک دانہ چکھ کر پوری دیگ کے بارے بتا سکتا ہے۔ اسی طرح میں نے جتنے مضامین پڑھے، ان سے تصنیف کے متن کا اندازہ مجھے ہو گیا ہے۔ یہاں یہ بھی واضح کرنا چاہوں گا کہ مصنفہ ہمارے اخبار، روزنامہ ''جرأت'' میں اشاعت کیلئے ہر اتوار کو باقاعدگی سے کالم بھیجتی ہیں۔ میں انہیں بغور پڑھ کر ٹائپنگ اغلاط کی درستی کرتا ہوں اس طرح مجھے کنیز بتول کی تحریروں کا ادراک ہے کہ وہ کیا لکھنے کا سامان کیے بیٹھی ہیں۔

ان کی تحریر کا ایک کمالِ ہنر یہ ہے کہ تقریباً ہر تحریر میں قرآنی آیات کا حوالہ ضرور ہوتا ہے۔ جب آیت کا حوالہ دیتی ہیں تو اس کا ترجمہ اور سورۃ کا نام مع آیت نمبر ضرور لکھتی ہیں۔ اس سے ان کی تحریروں کی شستگی، طہارت و پاکیزگی کا اندازہ لگایا جا سکتا۔ بحثیت ایک بزرگ دوست کے، میں نے مصنفہ کو ایک مہربان انسان پایا ہے۔

تحریروں کی پاکیزگی سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کنیز بتول کو اللہ نے کسی خاص مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ ویسے تو دنیا میں انسانوں کے ساتھ ساتھ جتنی بھی مخلوقات ہیں، ان میں کوئی بھی بلاوجہ نہیں، ہر مخلوق کی تخلیق کا ایک مقصد ہے، ہر مخلوق کے ذمہ ایک کام ہے، جب وہ کام ہو جائے تو مخلوق عمر پوری کر کے واپس اپنے خالق کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ اس انداز میں دیکھیں تو شاید کنیز بتول کی تخلیق کا مقصد ان کی تحریروں کے ذریعے فلاحِ انسانیت ہے۔ اگر ایسا ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ کنیز بتول اس فرض کو بطریقِ احسن انجام دے رہی ہیں۔

اور آخر میں ان الفاظ کے ساتھ اپنی تحریر ختم کرتا ہوں کہ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ ہو...... وہ اسی طرح اپنے علم کی روشن کرنیں پھیلا کر دنیا کی تاریکیاں مٹا کر نورِ الٰہی پھیلاتی رہیں اور بندگانِ خدا ان کی تحریروں سے نشانِ منزل پاتے اور سفر طے کرتے رہیں......

آمین ثُمّ آمین

دستک میں درد کی خوشبو

سید امیر کھوکھر

پی ایچ ڈی اسکالر، لاہور گیریژن یونیورسٹی

انسان جب سے اس کارگاہِ حیات کا باسی بنا ہے تب سے اس کا شعور اپنے ارتقائی مراحل طے کر رہا ہے۔ آج اکیسویں صدی میں اس کی سوچ، فکر اور تخیل کا پرندہ محیط و بسیط فضا کے کئی گوشوں تک نہ صرف رسائی حاصل کر چکا ہے بلکہ نت نئے جہانوں سے آشنائی و آگاہی کی مہم اس کی فطرت کا حصہ نظر آ رہی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی انسان کو قدرت کی طرف سے عطا کی گئی تاب و توانائی پر شاہد عادل ہے۔ مادی دنیا کے آفاق اس مشتِ خاک کی کمند افگن امنگوں کی زد پر ہیں۔ علم و فن کے ذریعے ایجادات کے نئے نئے نمونے حیرت انگیز طور پر منظرِ عام پر آ رہے ہیں لیکن آفاق کی اس ترقی میں انفسی دنیا کے معاملات تہ و بالا ہو رہے ہیں اور باطنی دنیا میں تاریکی کے سائے مسلسل بڑھتے جا رہے ہیں۔ افراتفری، نفسانفسی اور ظاہری چکاچوند نے قدرت کی تخلیق کے شاہکار کا حسن گہنا دیا ہے۔

خود غرضی کے خارزار پودوں نے اخلاص و ایثار کے گلشن کے حسن کو ماند کر دیا ہے۔ جلبِ زر اور منافع خوری کی عادت نے دوسروں کے دکھ درد کا احساس ختم کر دیا ہے۔ ظلم و عدوان کے عفریت نے عدل و انصاف کا خون کر دیا ہے۔ زمانہء جاہلیت کے طور اطوار اور افکار و کردار پھر سے اپنی تاریخ دہرا رہے ہیں۔ ایسے میں ان اربابِ قلم و قرطاس اور صاحبانِ علم و دانش کا وجود غنیمت ہے جو اُجڑے چمنِ انسانیت میں بادِ بہاری کے جھونکے کے طور پر اسے بہار آشنا کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان کا وجود گم کردہ راہ قافلہء انسانیت میں اس حدی خوان کا سا ہے

جو دلکش اور روح پرور لے میں گنگناتا ہوا قافلے کو منزل آشنا کرنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔

کنیز بتول کھوکھر کا شمار بھی انہی باکردار اور خوش اطوار اہلِ فکر و قلم میں ہوتا ہے جو اپنی فکری و قلمی توانائیاں فکری بے راہروی اور عملی بانجھ پن کا علاج کرنے میں صرف ہوتی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب "دستکِ درِ مقفل" پڑھنے کے بعد راقم اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ وہ نہ صرف صالح فکر اور سلیم الفطرت نوجوان لکھاری ہیں بلکہ ان میں اپنے وطنِ عزیز کے ہر فرد کے لیے اخلاص و درد کے جذبات ایک سمندر کی طرح متلاطم ہیں جو انھیں بالخصوص نوجوانوں کی اصلاح و فلاح پر مسلسل ابھارتے رہتے ہیں۔ اس بات کا عملی ثبوت ان کے کالموں اور مضامین کا زیر مجموعہ ہے۔ ان کے یہ کالم اگرچہ مختلف اخبارات میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے اور بالآخر ریکارڈ کا حصہ بن گئے ہوں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے کالموں اور مضامین کے موضوعات ایسے تھے جو زمان و مکان کی حدود سے بالاتر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اب انھیں کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ نگارشات کا یہ مجموعہ ہر دور اور ہر عمر کے فرد کے لیے ایک مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مایوسیوں کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں یہ امید کی کرن ہے جو بھٹکے ہوئے قافلۂ حجاز کو سوئے منزل روانہ ہونے پر قدم بہ قدم روشنی دیتی رہے گی۔ کالموں کے موضوعات اخلاقیات، معاملات، عبادات، معاشرت اور سیاسیات کے متنوع جہتوں کو محیط ہیں۔ کنیز بتول کھوکھر نے ان موضوعات کو انتہائی اختصار و جامعیت کے ساتھ نبھایا ہے۔ جملوں کا در و بست، فقروں کی نشست و برخاست، تشبیہات و استعارات کے برمحل استعمال اور تحریر کی شستگی و سادگی نے ان کالموں کو پڑھنے، سمجھنے اور ذہن نشیں کرنے کے لیے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ قرآن و احادیث کے موقع بہ موقع استدلال نے کتاب کی اہمیت کو زیادہ وقیع بنا دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ اردو انشائیہ نگاری میں ایک اہم کڑی ثابت ہوگی اور مصنفہ نے اصلاحِ فکر کے جس عزم بالجزم سے یہ فریضہ سرانجام دیا ہے، توقع سے بڑھ کر پذیرائی ملے گی۔ "دستکِ درِ مقفل" حقیقی معنوں میں فکر و عمل کے بند دریچوں کو کھولنے میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔ اس امید کی بنیاد مصنفہ کے سوز، درد اور اخلاص کی گہرائی پر ہے۔

قیصر الجعفری نے شاید اسی طرح کی دستک کے بارے میں لکھا تھا:

دستک میں کوئی درد کی خوشبو ضرور تھی
دروازہ کھولنے کے لیے گھر کا گھر اٹھا

دم توڑتے رشتے

نمازِ عصر سے فارغ ہوتے ہی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا، ادھیڑ عمر اماں جی کو کھڑے پایا۔ انہیں دیکھ کر مجھے لگا کہ اگر یہیں تعارف کروانے کو کہا تو شاید وہ تھکان کی وجہ سے گر جائیں گی۔ اس لیے انہیں اندر لائی۔ صدیوں کی مسافتوں سے چور بدن کسی گھنے سائے میں سکون کی تلاش میں تھا۔ پہلے تو انہوں نے اپنے اردگرد کے ماحول کو اجنبی نگاہوں سے دیکھا پھر ایک لمبی سانس لے کر بیٹھ گئیں۔ اماں جی کو دیکھ کر ایسے لگا جیسے حالات کے تغیر نے کسی پردہ نشین کو بے نقاب کر دیا ہو۔ انہوں نے اپنے کانپتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو سہارا دیتے ہوئے اپنا تعارف کروایا اور دھیرے سے داستانِ غم کا آغاز کیا جس کو سنتے ہی میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ اگر ان کی چشم میں پانی کی چند بوندیں باقی ہوتیں تو یقیناً نم ضرور ہوتیں۔ یہ خشکی اس بات کا ثبوت تھی کہ یہاں موسمِ برسات ایک طویل عرصہ ٹھہرا رہا ہو گا۔ نرم مزاجی اور اندازِ تکلم ان کے مہذب ہونے کی گواہی دے رہے تھے۔ مذہبی لگاؤ اور صبر سے صاف ظاہر تھا کہ ان کی تکلیف امتحانِ الٰہی ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے پیارے بندوں سے لیتے ہیں اور لفظوں میں ایسا اثر تھا کہ جو بھی دردِ دل رکھنے والا سنتا، اُسے زہرِ قاتل میں ڈوبے تیر کی طرح محسوس کرتا......اس میں ان لوگوں کے لیے بہت بڑا سبق تھا جو اکثر اوقات جسم وجاں کے مزار پر ارمانوں کا لباس اوڑھ کر خواہشات کے جنازے کو سامنے رکھتے ہیں اور ہر وقت مظلومیت کی صفِ ماتم بچھائے رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی داستان ایک استفہامیہ جملے پر ختم کی کہ جب کسی کے پیارے رشتے دار مر جائیں تو اس سے بڑھ کر بھی کوئی تکلیف ہوتی ہے؟......میں نے اثبات میں سر ہلایا تو انہیں حیرت سے جھٹکا لگا۔ اگر ہمت ساتھ دیتی تو سوال کرنے کی جسارت ضرور کرتیں۔ چند لمحوں کی خاموشی کو توڑتے ہوئے میں نے کہا:

کل نفس ذائقة الموت۔ (سورة الانبیاء، آیت-35)

موت کا ذائقہ ہر نفس نے چکھنا ہے، یہ سب جانتے ہیں۔ جس نے پیدا کیا، لوٹ کر اسی کے پاس جانا ہے۔ مالک جب چاہے واپس بلا لے۔ اس کے سامنے کسی کا بس نہیں چلتا۔ وہ بہتر حکمت والا ہے۔ اگر زخم دیتا ہے تو مرہم بھی لگا دیتا ہے۔ اس لیے گہرائی کا اندازہ نہیں ہوتا لیکن پھر بھی کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جن کو ہم برابر صدا لگاتے رہتے ہیں۔ یہ جاننے کے باوجود کہ جانے والے کبھی لوٹ کر نہیں آنے والے۔

جانے والے نہ آئے پلٹ کر کنیزؔ
پھر صدا کیوں برابر لگاتی رہی

مگر اماں جی کے چہرے کی جھریوں سے لے کر آنکھ کے تل تک اس انکشاف کے منتظر تھے کہ وہ تکلیف کیا ہے جو میرے درد سے بڑھ کر ہے۔ میں نے ان کی بے تابی کو دیکھتے ہوئے طوالت سے گریز کیا اور کہا کہ رشتے داروں کے مرنے سے زیادہ تکلیف اس وقت ہوتی ہے جب رشتے دار زندہ وسلامت ہوں اور ان کی نظروں کے سامنے رشتوں کا قتلِ عام ہونے لگے یا وہ سسکیاں لے کر دم توڑنے لگیں۔ حیرت زدہ آنکھیں سوال کرتی ہیں کیا رشتے بھی دم توڑ دیتے ہیں؟ کیا یہ جاندار ہوتے ہیں؟

جی ہاں رشتوں میں بھی جان ہوتی ہے اور ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ کچے دھاگے کی مانند کمزور اور شیشے کی طرح نازک بھی ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ شیشے غلطی سے جبکہ رشتے غلط فہمیوں سے ٹوٹتے ہیں۔ شیشے پر لگی لکیر واضح ہوتی ہے اور کبھی نہیں مٹتی جبکہ رشتوں میں پڑی دراڑیں کسی کو نظر نہیں آتیں لیکن ان کے گھاؤ احساسِ ہمدردی سے بھرے جا سکتے ہیں۔ نظرِ التفات سے زرد بیج سبز ہونے لگتے ہیں۔ یہ تو پھر رشتے ہیں۔ بس انہیں قائم رکھنے کا ارادہ اور حدود کا تعین ہونا چاہئے۔ ہر چیز اپنی حد میں اچھی لگتی ہے۔ بس اس کو حد کے اندر ہی رکھنا پڑتا ہے۔ ہر تعلق کا کوئی انجام ہوتا ہے۔ اگر اس سے ناواقف ہوں گے تو یہ بالکل ایسے ہی ہے:

کیا سوچ کے کرتا ہے وہ آغاز سفر کا
جو شخص یہاں واقفِ انجام نہیں ہے

رشتوں کی حدود مختلف ہونے کے باوجود کچھ اصول سب میں مشترک ہوتے ہیں۔ جیسے اعتماد، جو ہر رشتے کا بنیادی عنصر ہے۔ جہاں اعتماد نہیں ہوتا وہاں رشتہ قائم کرنے کی کوشش کی جائے تو

کھوکھلی دیواروں پر بغیر ستون کے چھت نہیں ڈالی جاسکتی۔ اعتماد کی نماز ٹوٹ جائے تو اس کی قضا بھی نہیں ہوتی۔ اس لیے کسی کا بھروسہ توڑتے وقت یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ اس میں نقصان اپنا ہی ہوگا۔ اصل میں تعلق ایک ڈور کی طرح ہے جس کے دونوں سروں کو مضبوطی سے پکڑا جائے تو ایک ڈور تن جاتی ہے۔ اسے برقرار رکھنے کے لیے فاصلہ برابر قائم رکھنا پڑتا ہے۔ اگر فاصلہ کم ہونے کی صورت میں رسی ڈھیلی پڑ جائے گی۔ اس طرح الجھ بھی سکتی ہے اور کچلی بھی جاسکتی ہے۔ فاصلہ بڑھ جائے تو کھچاؤ سے ٹوٹ بھی سکتی ہے۔ اس لیے اگر ایک طرف سے کھینچا جائے تو دوسری طرف سے نرمی برتی جائے اور اگر دوسری طرف سے کھینچا جائے پھر پہلی طرف سے تھوڑا نرم کر دیا جائے۔ اس طرح تعلق کو ہمیشہ کے لیے برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ اس میں اہم کردار رویوں کا ہوتا ہے۔ رویوں کو لفظوں کی طرح بیان نہیں کیا جاسکتا لیکن ان کا بوجھ ہمارے دل و دماغ کو تھکا دیتا ہے اور کبھی کبھی انجانے میں ادا کیے گئے الفاظ سننے والوں کا کلیجہ چھلنی کر دیتے ہیں اور ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ رشتوں کے بازار میں اعتبار کی جنس سب سے مہنگی ہے جس کو خریدنے کے لیے بعض اوقات خود کو گروی رکھنا پڑتا ہے۔ ایسے رشتے قسمت اور نصیب سے ملتے ہیں۔ اس لیے جن کو ملیں انہیں قدر کرنی چاہئے کیونکہ نصیب لکھنے والی ذات غلطیوں سے پاک ہے اور جو اس بنیاد پر قائم ہوں ان رشتوں کے درمیان دراڑ ڈالنے والوں کی مثال ایسے ہی ہے جیسے تیز رفتار گاڑی پر کسی کتے کا ایک پراعتماد حملہ۔ اگرچہ وہ اس تک کبھی پہنچ نہیں پاتا لیکن پھر بھی حملہ اس یقین کے ساتھ کرتا ہے کہ کامیابی ضرور ملے گی۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس نعمت سے محروم ہوں اور اپنی محرومیوں کا انتقام دوسروں سے لیتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ وہ اس کلیے کو سمجھیں کہ خلوصِ دل کے رشتوں کا کوئی نام نہیں ہوتا اور یہ بنانا پڑتے ہیں، چھینے نہیں جاتے، چھیننے کی کوشش کرنے والے آخر کار خالی ہاتھ رہ جاتے ہیں۔ انسانیت کے رشتے کے ناطے ہر انسان کا دوسرے انسان سے رشتہ ہے۔ اگر ہم اس بات کو سمجھتے تو آج ذات پات اور قوم و قبیلے کی وجہ سے فسادات سے آزاد ہوتے......

اے اللہ! ہمیں ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کرنے والا بنا دے اور مسلمانوں کے ٹوٹے اور بکھرے رشتوں کو جوڑ کر امتِ مسلمہ کو متحد کر دے۔ آمین۔

5 مارچ 2017ء

یادوں کے دریچے

سردیوں کی شام بعد نمازِ عشاء جب ہر طرف خاموشی کا راج تھا، میری سماعت سے ایک آواز ٹکرائی، انرجی سیور بند کر کے زیرو کا بلب آن کر دیں، زیرو کے ساتھ منسلک لفظ 'بشیرو' میرے ذہن میں گردش کرنے لگا۔ زیرو اور بشیرو کے امتزاج سے تاریخ کے کئی حسین باب کھل کر نظروں کے سامنے رقص کرنے لگے۔ یادوں کے دریچے کھل کر مدھم سی تصویریں دکھائی دینے لگیں۔ ایک بچہ جس کا لب ولہجہ اس کے قد سے کئی گنا بڑا محسوس ہو رہا تھا، بارعب آواز میں حکم صادر کر رہا تھا، اب زیرو کا بلب آن کرو اور بشیرو کا بند کرو، اب بشیرو کا بلب آن کرو اور زیرو بند کرو (بشیرو کا قافیہ اس نے خود ملا لیا تھا یعنی کہ زیرو سے بڑی لائٹ) ان دو جملوں پر دیر تک ریاضت ہوتی رہی۔ اس کا اندازِ تکلم اور خود اعتمادی سلطنتِ مغلیہ کے دربار کی یاد تازہ کر رہی تھی۔ ویسے تو دورِ حاضر کے حکمران بھی کچھ کم نہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ وہ دربار میں سزا سناتے تھے، سب کے سامنے دیوار میں چنوانے کا حکم دیتے اور درباریوں کے مطابق یہ صرف حکم ہی ہوتا تھا۔ اب اس کے برعکس عام معافی کے بعد نعش کسی ویرانے سے ملتی ہے لیکن پھر بھی یہ سہرا دنیا کے شہنشاہوں کے سر ہی سجتا ہے کہ ذرا سی کوتاہی پر ہاتھ قلم کرنے کا قانون بھی پاس ہو سکتا ہے۔ یہ یقین اور اعتماد سفید دوپٹے میں لپٹی ایک ضعیف سی شخصیت کی وجہ سے تھا جس کے پیچھے اس نے پناہ لے رکھی تھی کیونکہ یہ بزرگ ہستی اس کے لیے کسی مضبوط قلعہ سے کم نہ تھی۔ بے لوث محبت اور شفقت نے چند سال کے بچے کو نڈر اور بے باک بنا رکھا تھا۔ محبت اور اعتماد کی طاقت اگر ساتھ ہو تو انسان کوہساروں سے بھی ٹکرا جاتا ہے۔ اچانک غصے اور محبت کے ملے جلے جذبات سے بزرگ ہستی نے یوں پکارا، شخوت اللہ، تو وہ زیرو اور بشیرو کے تانے بانے سے نکل کر شفقت اللہ اور شخوت اللہ کی ڈور میں الجھ گیا۔ اب اماں کا تلفظ ٹھیک کروانے کی ناکام کوشش کا دور شروع ہوا۔ یہ سن کر مجھے یقین ہوا کہ میری ڈیوٹی ختم، میں نے ایک تبسم کے ساتھ اپنی گود میں پڑی ڈائری کو دیکھا جس کے کئی صفحات بھیگ چکے

تھے، وقت کے تیز رفتار گھوڑے کو جیسے پر لگ گئے، بچپن سے جوانی اور جوانی سے موت کا سفر ایک پل میں طے ہو گیا اور میرے لبوں سے فقط یہ کلمات نکل سکے،

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ (البقرہ، آیت۔156)

بے شک اللہ نے پیدا کیا اور لوٹ کر اسی کے پاس جانا ہے۔ موت کا ایک وقت مقرر ہے اور وہ ٹل نہیں سکتا۔ ہر چیز فانی ہے بس صرف اللہ کی ذاتِ بابرکات باقی رہ جانے والی ہے۔ جانے والے کب رکتے ہیں لیکن ہر موت صالح فطرت کے لیے باعثِ عبرت ہوتی ہے، صرف انہوں نے نہیں جانا تھا جو چلے گئے بلکہ اب ہماری باری ہے، اس لیے ہر وقت تیار رہنا چاہئے۔ کچھ لوگ اس انداز سے زندگی گزارتے ہیں کہ اس دنیائے فانی سے چلے جانے کے بعد بھی ہمیشہ دلوں میں زندہ رہتے ہیں اور ان کی یادوں کا موسم کبھی نہیں بدلتا۔ البتہ یہ تغیر ضرور آتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی قدر میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے لیکن یادوں پر جتنے بھی پہرے لگائے جائیں، یہ آندھی رکنے والی نہیں ہوتی۔ بہار کی رت میں بچھڑنے والوں کی یاد سدا بہار رہتی ہے۔

ہمیں یاد ان کی ہزار آئے گی پھر
کہ جب بھی چمن میں بہار آئے گی پھر
کہ آخر ہمیں بھی وہیں پر ہے جانا
حقیقت یہی ہے ، یہی ہے فسانہ

انسان کے اندر کا موسم باہر کے موسم پر اثر انداز ہوتا ہے، باطنی کیفیت ہر حال میں عیاں ہو کر رہتی ہے خوشی کے وقت ہر طرف بہار ہی بہار نظر آتی ہے۔ جب اداسی کا موسم چھا جائے پھر بہار میں بھی درختوں کے پتوں کے گرنے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ سارے موسم دل کے ساتھ بدلتے ہیں ہر انسان کی زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصدِ حیات ہوتا ہے۔ کچھ لوگ مختصر وقت میں اسے پا لیتے ہیں۔ ایسا شاید اس لیے ہوتا ہے کہ ان کے پاس وقت کی قلت ہوتی ہے اور کچھ عمرِ دراز گزارنے کے باوجود خالی ہاتھ رہ جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی زندگی موبائل فون پر کھیلے جانے والے کھیل کی سی ہوتی ہے۔ کئی گھنٹوں کی مشقت کے بعد بھی حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ ان کو زندگی کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہوتا یا پھر آخرت کی فکر نہیں ہوتی۔ اگر ہوتی تو اتنی قیمتی چیز کو ایسے ضائع جانے نہیں دیتے...... ہر گز نہیں...... ایسے ہی لوگوں کے لیے ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

ترجمہ: ''اور انہوں نے کہا بس یہی ہماری موجودہ زندگی ہے ہم دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے۔'' (سورۃ الانعام۔ آیت، 29)

اسی طرح سورۃ المومنون میں سوالیہ انداز سے پوچھا گیا، کہ ہم نے تمہیں بے کار پیدا کیا ہے؟ نہیں، اللہ نے کسی چیز کو بے کار پیدا نہیں کیا بس اس کی حکمت کو سمجھنا کسی اور کے بس کی بات نہیں۔

جب کوئی ہمارا پیارا اس دنیائے فانی سے کوچ کر جائے تو ہم آنسو بہانے کے سوا اور کیا کرتے ہیں؟ چشمِ نم سے کی گئی دعا کبھی رد نہیں ہوتی اور ہم اس قیمتی گھڑی کو دنیا کی رسموں میں ضائع کر دیتے ہیں۔ میت سامنے ہوتی ہے اور فضول باتیں اور کام شروع ہو جاتے ہیں۔ یہی تو استغفار کا وقت ہوتا ہے، ڈرنے کا کہ ہمارا بھی یہی انجام ہونا ہے۔ ہو سکتا ہے اگلی باری ہماری ہو۔ خود کو اس حساب کے لیے تیار کر لیں۔ مہمان نوازی کے لیے جنازے کا انتظار بھی نہیں کیا جاتا۔ قبرستان سے واپسی پر اگلے پروگرام کی تیاریاں ہونے لگتی ہیں۔ آج کل یہ بھی پوچھنا پڑتا ہے کہ یہاں کوئی شادی ہے یا کسی کی موت ہوئی ہے؟ یہ ان کے لیے دعائے مغفرت کا اور اپنے لیے صبر کی دعا کا وقت ہے۔ ان آنسوؤں سے ہم اللہ کو منا سکتے ہیں۔ اپنے پیاروں کی اعلیٰ خصوصات کو اپنی ذات کا حصہ بنانے کی بجائے ان کے ادھورے مشن ان کے ساتھ ہی دفن کر دیے جاتے ہیں اور اکثر لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اب ہمارے کام کون کرے گا؟ یہ کیسی محبت ہے؟ عزیز سب کو تھا مگر ضرورتوں کی طرح...... بس اس کی موت کا نقصان صرف کام کا رک جانا ہے۔

'انسان' لفظ کا مطلب، ہی بھلکڑ، یعنی بھول جانے والا ہے۔ جس چیز کو سب سے زیادہ بھولتا ہے وہ موت ہے۔ ایسے لوگوں سے قبرستان بھرے پڑے ہیں جو سمجھتے تھے کہ ان کے بغیر دنیا چل ہی نہیں سکتی۔ بھول بھلیوں میں اتنا مگن ہو گئے کہ موت کو ہی بھول بیٹھے۔ قرآنِ پاک میں توحید کے بعد سب سے زیادہ ذکر موت کا ہے اور ہم اسی کو بھول بیٹھے ہیں۔ اموات و حادثات سے اہسپتال اور قبرستان بھرے پڑے ہیں۔ ان کو دیکھنے کے باوجود انسان کس خمار میں ہے؟ نجانے کتنے زمانے زمین میں سما گئے؟

بس یہی نظامِ قدرت ہے۔ کچھ مختصر وقت میں اپنا کام مکمل کر کے مالکِ حقیقی کے پاس لوٹ جاتے ہیں اور ان کی یادیں باقی رہ جاتی ہیں۔ مرنے والوں کے ساتھ کوئی مرتا نہیں لیکن ان کے بغیر اندازِ زندگی بدل جاتا ہے۔

4 مئی 2017ء

احساسِ ذِمہ داری

سورج غروب ہونے سے قبل آسمان پر پھیلی سرخی یوں تھی جیسے حجلۂ عروسی میں بیٹھی دلہن شرما رہی ہو۔ پرندوں کی قطاروں کا مغرب کی طرف سفر اس یقین کو پختہ کر رہا تھا کہ یہ سفر کسی حسینہ کے شوقِ دیدار میں ہو رہا ہے۔ دن بھر کے تھکے انسان اپنے کام نمٹا کر منزلوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ علی کا باپ اپنے گھر قدم رکھتے ہی کندھوں پر لدی چارے کی گٹھڑی ایسے زمین پر پھینکتا ہے جیسے اپنی ہی نعش کو کندھوں پر اٹھائے ایک طویل مسافت سے واپس ہوا ہو اور اس پر قیامت یہ کہ کوئی پرسہ دینے والا بھی نہیں۔ سامنے چند قدم کے فاصلے پر ایک ٹیڑھی سی چارپائی پر لیٹا علی اپنے اِردگرد سے بے خبر درختوں کے جھروکوں سے آسمان کو ٹکٹکی باندھے اپنے خیالوں میں حسیناؤں کے جھرمٹ میں بیٹھا یوں محسوس کر رہا تھا گویا ستاروں کے درمیان چاند اپنی پوری آب و تاب سے جگمگا رہا ہو۔

دوشیزاؤں کی محفل میں خیالوں کے جھولے میں جھولتے ہوئے اسے محسوس ہی نہ ہو سکا کہ سرہانے بیٹھا اس کا باپ کن سوچوں میں گم ہے۔ حالات سے بے نیاز اپنے بیٹے کو دیکھ کر باپ کو اپنا عہدِ شباب یاد آیا۔ وہ تعلیم سے محروم انسان جب والد کو کام کرتے دیکھتا تو ندامت میں ڈوب جاتا تھا جبکہ یہ تعلیم یافتہ اس احساس سے خالی کیوں؟ ابھی تاریخ کا ایک باب بھی مکمل نہ ہونے پایا تھا کہ اس نے اپنی گود میں پانی کی گرتی ہوئی بوندوں کو محسوس کیا۔ آنسوؤں کے اس لشکرِ جرار کو مدعو کرنے والی اس کے باپ کی یاد تھی، بیٹے کی بے حسی یا اس کی تربیت؟......وہ کسی نتیجے تک نہ پہنچ سکا۔

دوسری طرف اس کی بیوی گوبر کے ڈھیر کو دیکھ کر ایسے مسرت سے سرشار ہو رہی تھی جیسے یہی اس کی متاعِ حیات ہو۔ ہاتھوں کی لکیریں جن کو عام طور پر مقدر کی لکیریں سمجھا جاتا ہے، اس کے ہاتھوں پر شاید گوبر کا سبز رنگ بھرنے کے لیے تھیں۔ حالات اور سوچوں میں زمین و آسمان کا فرق......اتنا تضاد کیوں؟

دلوں میں اتنے فاصلے ہوں تو رشتوں میں قربت ممکن نہیں ہوتی۔ لیکن اس کا ذمہ دار کون ہے؟

والدین یا اولاد؟ میرے خیال کے مطابق ان دونوں کے علاوہ معاشرہ بھی برابر کا شریک ہے۔ کیونکہ ہم اس کی اندھا دھند تقلید کرتے ہیں۔ تربیت گھر سے شروع ہوتی ہے۔ جب بچے کو سکول بھیجا جاتا ہے، اسے مقاصدِ تعلیم سے آگاہی بھی ضروری ہے کہ تعلیم حاصل کرنے کا مقصد اچھا انسان بننا ہے۔ خالق نے انسان کی تخلیق کیوں کی؟ اور ہم نے واپس اس کے پاس جا کر کیا حساب دینا ہے؟...... اس کے برعکس ہمارے معاشرے میں صرف افسر شاہی کے خواب دکھائے جاتے ہیں۔ جیسی نیت ہو گی ویسی مراد ملے گی۔ بچے کی ابتدائی تعلیم کے نصاب کے مطابق اس پر عمل بھی سکھایا جائے۔ اس لیے والدین اور اساتذہ دونوں کا اہم کردار ہے۔ ان کی شخصیت بچوں پر گہرے اثرات چھوڑتی ہے۔ نصاب ایسا ہو کہ بچے بآسانی اس پر عمل کر سکیں اور ایسا تبھی ممکن ہو گا اگر وہ بڑوں کو ایسے کرتا دیکھیں گے۔ اگر عمل کرنا سکھایا جائے تو وہ بچوں کی ذات کا حصہ بن جاتا ہے۔ ان کی ہر عادت کے اندر چھپے فوائد و نقصانات کے بارے میں انہیں بتایا جانا چاہئے تاکہ سمجھ آنے پر بری عادات کو وہ خود ختم کر سکیں اور اچھی عادات اپنا سکیں۔ والدین اور اساتذہ دونوں کی یہ ذمہ داری ہے لیکن ہم صرف اخلاق کا سبق دیتے ہیں اس کا عملی نمونہ پیش نہیں کرتے۔ بڑوں کے ہر کام سے بچے سیکھ رہے ہوتے ہیں۔ زبان و بیان، لب ولہجہ، مذہبی و سماجی اقدار، جذبات و تاثرات، دلچسپیاں، رویے، پسند و ناپسند، نشست و برخاست، عادات و اطوار، غرضیکہ تمام خصوصیات دیکھ کر اپناتے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں اسلامیات کو نصاب کا حصہ بنایا گیا ہے لیکن وقفۂ نماز نہیں قائم کیا گیا۔ اگر اساتذہ جو قوم کے معمار ہیں، اس پر عمل کریں تو پھر طلبہ وطلبات سے عمل کروانا ان کے ایک جنبشِ ابرو کا محتاج ہو گا۔ اگر وہ اپنی زندگی کا مطالعہ کر کے جائزہ لیں تو قول وفعل میں کتنا تضاد نظر آئے گا لیکن اس نقطے پر سوچ کون؟ تعلیم ہم کس مقصد کے لیے حاصل کرتے ہیں؟ اگر کوئی تعلیم یافتہ فرد اپنے آپ کو اور اردگرد کے ماحول کو بدلنے کی کوشش کرے تو اسے قدم قدم پر پُرخار رستوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ سوچوں کی منجدھار میں پھنس جائے۔ اس کا مقابلہ کرنے والوں کو صحیح اور غلط کے مابین فرق معلوم ہو، تب بھی دوسروں کی راہ کا پتھر ضرور بنتے ہیں۔ یہ جاننے کے باوجود کہ دوسرے درست سمت میں جا رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کی اپنی کوئی منزل نہیں ہوتی بلکہ ان کا مقصد دوسروں سے آگے نکلنا ہے۔ اس کا ایک بہترین اور مثبت طریقہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنی رفتار تیز کریں لیکن سستی کے ماروں کی خواہش ہوتی ہے ہر چیز پلیٹ میں سجا

کر انہیں پیش کر دی جائے۔ جنہوں نے اپنی منزل کا تعین کر لیا ہے، وہ رستے کی بھول بھلیوں کو نہیں دیکھتے کیونکہ رکاوٹیں ہوتی ہی گمراہ کرنے کیلئے ہیں لیکن وہ منزل کی طرف رواں دواں رہتے ہیں یہاں تک کہ منزل خود قریب آ جاتی ہے۔ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے۔

دنیا پھولوں کی سیج تو نہیں ہے، اس کا اندازہ انسان کو اس وقت ہوتا ہے جب اس کے خیالات حالات کی فلک بوس چٹانوں سے ٹکرا کر سمندر کی موجوں کی طرح واپس لوٹ آئیں، تب اسے وقت کی تلخ مزاجی کا احساس ہوتا ہے کیونکہ وقت تو کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ انسان خواہ کتنا ہی صاحبِ حیثیت ہو جائے، وہ اپنا گزرا ہوا کل واپس نہیں لا سکتا اور ہمیں اس انمول نعمت کی قدر ہی نہیں کہ دنیا کے کھیل تماشوں میں زندگیاں ضائع کر دیتے ہیں۔ جو دوسروں کی بے حسی کا رونا روتے ہیں انہیں اپنا کردار بھی دیکھنا چاہیے۔ اگر ہمارے حقوق پورے نہیں ہو رہے تو کیا ہم اپنے فرائض پورے کر رہے ہیں؟

اپنے گریبان میں جھانکنے پر قصور وار خود ہی ہوں گے۔ کیا وجہ ہے کہ بچے بڑوں کا ادب نہیں کرتے؟ ہم نے انہیں بزرگوں کی عزت کرنا سکھایا ہی نہیں، تو یہ ہماری تربیت کا اثر ہے جس کا احساس بعد میں ہوتا ہے کہ کہیں کمی رہ گئی۔ جو دوسروں کے جذبات و احساسات کا خیال نہیں رکھتے انہیں داستانِ غم سنانا اپنے لفظوں کو ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ ہمیں اپنی ذمہ داریاں فصل کاٹتے وقت یاد آتی ہیں جب ہاتھ کانٹوں سے زخمی ہوتے ہیں کہ کیا بویا تھا۔ کاش بوائی کے وقت اس بات کا خیال آتا کہ جو بیج ڈال رہے ہیں اسی سے فصل نے تیار ہو کر سامنے آنا ہے اور اسی کو کاٹنا پڑے گا۔ ہمارے رب نے سورۃ النساء میں ہمیں سمجھایا ہے۔

ترجمہ: ''اور عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی اور مت شریک لاؤ ساتھ اس کے کسی چیز کو اور ساتھ والدین کے احسان کرو اور ساتھ قرابت والوں کے اور یتیموں کے اور فقیروں کے اور ہمسائے قرابت والوں کے اور ہمسائے اجنبی کے اور پاس بیٹھنے والے کے اور مسافر کے اور ان کے جن کے مالک تمہارے ہاتھ ہیں (لونڈی غلام سے) بے شک اللہ نہیں دوست رکھتا اس شخص کو کہ ہو تکبر کرنے والا شیخی کرنے والا۔'' (سورۃ النساء۔ آیت 36:)

کیا ہم ویسے ہی کرتے ہیں جیسا ہمیں حکم دیا گیا؟

اگر ہم اپنے ربِ کریم کے حکم کو مانتے تو آج مناظر کچھ اور ہوتے۔ آزادی اور پابندی کا امتزاج اس شعر میں کتنی خوبصورتی سے ملتا ہے۔

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گل بھی ہے
انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

15 جولائی 2017ء

تربیّت

ہر بچہ فطرتِ سلیم پر دنیا میں آتا ہے یعنی پیدائش کے وقت وہ معصوم ہوتا ہے۔اس وقت بچے میں کسی کو پہچاننے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔جیسے جیسے اس کی نشوونما ہوتی ہے، وہ اپنے آس پاس کے لوگوں کو جاننے اور پہچاننے لگتا ہے۔پہلے شکلیں اور آواز اور پھر طبیعت سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔آہستہ آہستہ اپنے قریبی لوگوں پر اعتماد کرنے لگتا ہے۔جہاں دوسروں پر یقین پختہ ہوتا ہے وہاں خوداعتمادی بھی ذات کا حصہ بنتی جاتی ہے۔ان میں سے کچھ عادات موروثی ہوتی ہیں اور کچھ ماحول وتربیت سے پروان چڑھتی ہیں۔وہ اپنے آس پاس جیسے لوگوں کو دیکھے گا ویسا ہی بننے کی کوشش کرے گا۔بچوں کی خواہشات بڑوں کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہیں۔جو کام کسی کو کرتا دیکھتے ہیں، وہی کرتے ہیں۔جو چیز کسی کے پاس دیکھیں گے، وہی مانگیں گے۔اس عمر کے بچوں کے لیے ان کے والدین کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے کیونکہ بچے وہ نہیں بننا چاہتے جواُن کے والدین بنانے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ ان میں اپنے والدین جیسا بننے کی خواہش ہوتی ہے۔اگر والدین کے قول وفعل میں تضاد ہوگا تو بچوں میں بے یقینی پیدا ہوگی اوراسی عمر میں سوچ کی تربیت ہوتی ہے، جیسی سوچ کے لوگ اردگرد ہوں گے، ویسی ہی سوچ نئی نسل میں منتقل کرسکیں گے۔

بچوں کی تمام تر خواہشات کو پورا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔اس لیے وہ تمنائیں جو پوری نہیں کی جا سکتیں، انہیں مثبت طریقے سے ختم کردینا چاہئے مثلاً ایک غریب فیملی کا بچہ کھانے کی کوئی نایاب چیز مانگتا ہے جوان کی دسترس سے باہر ہو تو ماں اپنے بچے کو اس طرح سمجھا سکتی ہے کہ یہ چیز صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔اس کے کھانے سے طبیعت خراب ہو جائے گی، بیماری کی صورت میں سکول سے چھٹی کرنا پڑے گی، غیر حاضری کی بنا پر تعلیم میں حرج ہوگا اور کلاس میں آپ کی اچھی پوزیشن نہیں آئے گی وغیرہ وغیرہ......اس طرح بچے کے دل سے وہ خیال نکل جائے گا جس نے اسے پریشان کر رکھا تھا اور اس کی ذات پر منفی اثرات نہیں پڑیں گے۔اس کے برعکس اگر کوئی

وعدہ کیا جائے کہ اب پیسے نہیں، جب آئیں گے تو ضرور دلوا دیں گے، اس سے امید تو باقی رہے گی اور جب پیسہ آیا، کسی اور کام پر لگ گیا تو؟...... بچہ اس بات پر توجہ نہیں دے پاتا کہ ضرورت اور خواہش کے درمیان فرق محسوس کر سکے لہٰذا وہ یہی نتیجہ اخذ کرے گا کہ اس کی ماں نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ قول و فعل کے تضاد سے وہ بہت سی الجھنوں کا شکار بھی ہو سکتا ہے۔ لفظوں کا ہیر پھیر انسانی سوچ کو ظاہر کرتا ہے جس سے بڑا نقصان یہ ہو سکتا ہے کہ اس محرومی سے بچہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جائے۔ دوسرا یہ کہ اس کی خواہش وقتی طور پر دب جاتی ہے لیکن ختم کبھی نہیں ہوتی۔ وقت اور حالات کے ساتھ اس کی طلب میں شدّت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ شدّت اسے ذہنی اضطراب کا شکار بنا دیتی ہے جو اس کی شخصیت پر اثر انداز ہونے لگتا ہے۔ جیسے زیرِ زمین بیج سے پودا نکل کر پروان چڑھتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ تناور درخت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

انسان چونکہ ذہن اور جسم کا مجموعہ ہے، اس لیے اس کے ذہن میں خلا پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچپن کی ادھوری حسرتیں زندگی کے کسی موڑ پر پوری ہو بھی جائیں تو وہ خلا نہیں بھرتا۔ کیونکہ وہ بچپن کا دور تھا، نہ بچپن لوٹ کر آ سکتا ہے اور نہ وہ کمی پوری ہو سکتی ہے، ہاں البتہ انسان خود کوشش کر کے اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر بہتر طور پر اپنے ماحول کے مطابق ہم آہنگی پیدا کر سکتا ہے۔ اگر ایسا نہ کر سکے تو مایوسی اس کا مقدر بنتی ہے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ مایوسی کفر کی طرف لے جاتی ہے، ایسے لوگ احساسِ کمتری کا شکار ہونے لگتے ہیں، انہیں محسوس ہونے لگتا ہے کہ ان کی باطنی کیفیات اور خامیاں عیاں ہوتی ہیں، انہیں چھپانے کے لیے اپنا ماضی چھپا کر حال کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں، دوسروں کی کمزوریوں کا مذاق اڑاتے ہیں، انہیں کمتر اور حقیر سمجھتے ہیں اور اپنی جھوٹی شان کی تعریف سن کر خوش ہوتے ہیں۔ ان باتوں سے انہیں وقتی سکون تو مل سکتا ہے لیکن حقیقت نہیں بدلتی۔ بے یقینی چین سے انہیں رہنے نہیں دیتی۔ اس چھپن چھپائی کے کھیل کو وہ اپنے ذہن پر مسلط کر لیتے ہیں۔ غلط بیانی اور قول و فعل میں تضاد ان کا وطیرہ بن جاتا ہے۔ انہی عادات کی وجہ سے وہ قابلِ احترام نہیں رہتے اور لوگوں کا اعتبار حاصل کرنے کے لیے دوسروں کے خلاف ہرزہ سرائی شروع کر دیتے ہیں تاکہ انہیں نیچا دکھا کر خود کو برتر ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ اپنی ذات کی خامیوں سے واقف ہونے کی وجہ سے انہیں یہاں بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح ان کے ہر عمل کے بعد بے یقینی

ان کا خیر مقدم کرتی ہے اور وہ ذہنی الجھنوں کا شکار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس منجدھار سے نکلنے کے لیے انہیں چاہئے کہ وہ قرآن وسنت کا مطالعہ کریں اور اپنی زندگی کو اسلامی اصولوں کے مطابق گزارنے کی کوشش کریں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد پورے کریں۔ توکل، قناعت اور صبر سے کام لیتے ہوئے خود کو بہتر ماحول کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت پیدا کریں۔ اپنی خواہشات کو ضبط کریں اور ان کی شدت میں کمی لائیں۔ یہ اصول انسان کے اندر گہرا شعور بیدار کرتے ہیں جس سے وہ اپنی ذات کے حصار سے نکل کر احکامِ الٰہی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

ترجمہ: ''جو لوگ ایمان لائے ان کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرتے ہیں یاد رکھو اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان ملتا ہے۔''

(سورۃ الرعد۔ آیت: 28)

اصلاحِ قلب کے لیے اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کے ساتھ ساتھ حلقۂ احباب کا جائزہ بھی ضروری ہے۔ جب تک اہلِ غفلت کی صحبت سے نکل نہیں جاتے تکمیلِ ذات ممکن نہیں۔ قدم قدم پر اپنا احتساب کرنا پڑتا ہے۔ صاحبِ بصیرت لوگ اپنے اندر ایک نئی ذات دریافت کرتے ہیں اور دریافت کا یہ عمل مہد سے لحد تک جاری رہتا ہے۔ دلوں کا سکون صرف اللہ تعالیٰ کے ذکر میں ہے۔ جو لوگ اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔ حدیث پاک بھی اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔

ترجمہ: ''گناہ وہ جو تیرے دل میں کھٹکے۔''

لہٰذا جس کام سے دل کا اطمینان جاتا رہے سمجھو وہ گناہ ہے۔ دوسروں کی اندھا دھند تقلید کے بجائے عقل سے کام لینا چاہئے۔ ہر انسان میں خداداد صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں۔ انہیں تلاش کر کے اپنی ذات پر اعتماد کرنا چاہئے۔ جب کوئی خود اعتمادی کھو بیٹھے وہ دوسروں کے ہاتھوں کھلونا بن جاتا ہے۔ اس کے تمام عقائد کمزور پڑنے لگتے ہیں اور عقیدۂ توحید میں کمزوری کی گنجائش نہیں۔

شاعر نے اس کا نقشہ یوں خوبصوتی سے کھینچا ہے۔

مکمل دو ہی دانوں پر یہ تسبیحِ محبت ہے
جو آئے تیسرا دانہ یہ ڈوری ٹوٹ جاتی ہے
مقرر وقت ہوتا ہے محبت کی نمازوں کا

ادا جن کی نکل جائے قضا بھی چھوٹ جاتی ہے
محبت کی نمازوں میں امامت ایک کو سونپو
اِسے تکنے اُسے تکنے سے نیت ٹوٹ جاتی ہے
محبت دل کا سجدہ ہے جو ہے توحید پر قائم
نظر کے شرک والوں سے محبت روٹھ جاتی ہے

25 اگست 2017ء

خوابوں کے اثرات

خواب ہماری زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں، ہر شخص یہ دیکھتا ہے۔اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتا بھی ہے۔نیند کی صورت میں اور کھلی آنکھ سے بھی۔خواب بند آنکھ کے ہوں یا کھلی کے، دونوں کی مختلف اقسام ہوتی ہے۔پہلی قسم کے خواب دیکھنا انسان کے بس میں نہیں اور اس میں کسی کی مرضی شامل نہیں ہوتی۔اوپر والی ذات انتخاب کرتی ہے کہ کس کو کیا دکھانا ہے۔ جب کوئی شخص کسی چیز یا کسی کام کو خود پر مسلط کر لے یا اس کے لیے جنونی ہو جائے تو نیند میں بھی اسے وہی نظر آتا ہے۔ایسے خواب اکثر خیال ہوتے ہیں۔کچھ کی تعبیر اُلٹ بھی ہوتی ہے۔اللہ کے نیک بندے جو اس کی یاد میں ہی رہتے ہیں، ان کے خواب سچے بھی ہوتے ہیں۔وہ ان سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں، خود کو اگر تکلیف میں دیکھیں تو اپنی ذات کا احتساب کرتے ہیں کہ یہ ہماری کس خطا کی سزا ہو سکتی ہے اور اس طرح اپنے اندر چھوٹی سے چھوٹی خامی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔کچھ اچھا نظر آنے پر اپنے رب کے پہلے سے زیادہ شکر گزار ہو جاتے ہیں۔

خواب ایک طرف تو یہ ہدایت کا ذریعہ بنتے ہیں، دوسری طرف کم علم لوگوں کے لیے گمراہی کا سبب بھی، مثلاً خواب میں زیارتِ خانہ کعبہ، زیارتِ روضہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا کسی برگزیدہ بندے کے دیدار سے اپنے نیک ہونے کی خود ہی تصدیق کر لیتے ہیں اور داستانیں بنا کر پھیلاتے ہیں تاکہ سننے والے ان کو ولی اللہ مانیں۔ہمارے معاشرے کا یہی المیہ ہے۔اپنے منہ سے تعریف کرنے والوں کو ہمارا دل نہیں مانتا، پر لوگوں کا دماغ تک مان جاتا ہے۔پھر وہ باقاعدہ پیری مریدی شروع کر دیتے ہیں۔ان کو ماننے والے لوگ باآسانی مل جاتے ہیں اور یہ اپنے خواب سنانا شروع کر دیتے ہیں جن کی تعبیر انہیں کچھ اس طرح بتائی جاتی ہے کہ آپ پر کسی نے جادو کر دیا ہے یا پھر جنات کا سایہ ہے۔ان سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہم سے عمل کروائیں، ہمارے

پاس مؤکل ہیں۔ کالے بکروں کے صدقہ کے ساتھ ان کی بھاری فیس ادا کرنا پڑتی ہے۔ کمزور ایمان والے لوگ ایسا کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں اور اللہ سے ڈرنے کے بجائے گمراہ ہو جاتے ہیں۔ خوابوں کے اسرار و رموز کے حوالے سے قرآن و سنت سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

خوابوں کی دوسری قسم کھلی آنکھوں کے خواب ہیں۔ ان کا تعلق افراد کی دلچسپی پر ہوتا ہے۔ وہ اپنے ذوق و شوق ذہانت و فطانت کے مطابق دیکھتے ہیں۔ یہ ان کو آگے بڑھنے میں مدد دیتے ہیں کیونکہ پہلے خواب دیکھا جاتا ہے، پھر اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایسے لوگ محنت و لگن کی وجہ سے اپنے مقاصد میں اکثر کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اگر نتائج ان کی خواہشات کے مطابق نہ بھی آئیں تو اسے رضائے الٰہی یا پھر اپنی کوتاہی سمجھتے ہوئے ازسرِ نو محنت میں لگ جاتے ہیں اور آخر کار فلک بوس منزل ان کے قدموں میں ہوتی ہے۔ جس چیز کی اہمیت زیادہ ہو گی، اسے پانے کی خواہش اتنی شدید ہو گی کیونکہ جو شخص پیاسا نہیں ہوتا، وہ شیریں مشروب کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ خواب نہ کسی کی میراث ہے، نہ دیکھنے پر کوئی پابندی، البتہ کچھ لوگ تعبیر پانے کے لیے معجزے کے انتظار میں رہتے ہیں۔ اپنی اوقات اور حیثیت سے بڑھ کر تمنائیں کرنے والوں کی خواہشات بے لگام گھوڑے کی طرح ہوتی ہیں جن کو لگام ڈالنا انسان کا کام ہے۔ یہ فطرتِ انسانی ہے کہ راہِ حق پر چلتے ہوئے جب مسلسل مصائب و نقصانات کا سامنا کرنا پڑے تو صبر کا دامن چھوڑ بیٹھتا ہے۔ ربُ العزت نے انہی مواقع پر انسان کی حوصلہ افزائی کے لیے صبر کی تلقین فرمائی۔

ترجمہ: ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو مدد چاہو ساتھ صبر کے اور نماز کے بے شک اللہ تعالیٰ ساتھ صبر کرنے والوں کے ہے۔'' (البقرہ، آیت نمبر 153)

یہاں اہلِ ایمان کو صبر کی تلقین کے ساتھ اللہ کی معاونت کا یقین دلایا گیا ہے لیکن انسان تو جلد باز ہے، وہ فوری نتیجہ حاصل کرنا چاہتا ہے جس میں نقصان اس کا اپنا ہی ہے کیونکہ جب خواب ٹوٹتے ہیں تو کرچیاں نہ صرف دیر تک آنکھوں میں چبھتی رہتی ہیں بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ چبھن میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ درد کا اگلا مسکن دل ہوتا ہے اور دردِ دل پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ یہ وہ اذیت ہے جسے انسان نے اپنے لیے خود تجویز کیا ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنی ذات، خواہشات اور نفس کو حدود میں رکھتا تو بے جا تکلیف سے بچ سکتا تھا۔ یہ نفس ہی ہے جو اسے مافوق

الفطرت خواب دیکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ فطری طور پر انسان کے ساتھ دو دشمن ہر وقت موجود ہوتے ہیں۔ ایک نفس دوسرا شیطان۔ جب انسان سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اپنا دفاع ان الفاظ میں کرتا ہے کہ میں بندہ بشر ہوں اور شیطان کے چکر میں آ گیا۔ بات تو ان کی بھی ٹھیک ہوتی ہے لیکن ابلیس کا وار تب چلتا ہے جب نفس قبضے میں نہ رہے۔ اللہ کے پیارے بندوں پر شیطان زیادہ وار کرتا ہے لیکن اُسے ہمیشہ منہ کی کھانی پڑتی ہے کیونکہ اللہ کے برگزیدہ بندوں کا اپنے آپ پر پورا کنٹرول ہوتا ہے۔ وہ تمام دروازے ہمیشہ کے لیے بند رکھتے ہیں جن پر دستک کا گمان ہو۔

انسان اپنے علم، عقل و شعور کی وجہ سے اشرف المخلوقات ہے۔ وہ دوسروں کے بہکاوے میں تب آتا ہے جب مقصدِ حیات بھول کر چند روزہ زندگی کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے۔ آسائشوں کی خاطر کمزور پڑ جاتا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر دوسری طاقتیں انسان پر غالب آ جاتی ہیں۔ قرآنِ پاک میں متعدد مقامات پر اس حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی کہ پوری کائنات انسان کے لیے بنائی گئی لیکن انسان صرف اللہ کیلئے...... اور اس ذاتِ بابرکات نے سب نعمتیں برابر تقسیم کی ہیں۔ کسی کو عقل دی، کسی کو اولاد، کسی کو حسن، کسی کو صبر، کسی کو تقویٰ، ہاں دنیا کسی کو کم، کسی کو زیادہ دی، کم یا زیادہ دینے میں اس کی کوئی مصلحت ہوگی۔ وہ چاہتا تو سب میں برابر تقسیم کر دیتا۔ اگر ایسا ہوتا تو مقصدِ حیات فوت ہو جاتا۔ یہ دنیا آزمائش ہے۔ جس کو کم دی، اس کی بھی آزمائش، جسے زیادہ دی، اس کی بھی آزمائش...... سورۃ طٰہٰ میں اس کا واضح ذکر موجود ہے۔

ترجمہ: ''اور ہرگز مت لمبی کر دونوں آنکھوں اپنی کو طرف اس چیز کی کہ فائدہ دیا ہے ہم نے ساتھ اس کے لوگوں کو ان میں سے آرائش زندگانی دنیا کی تاکہ آزمائیں ہم ان کو بیچ اس کے اور رزق پروردگار تیرے کا بہتر ہے اور بہت باقی رہنے والا ہے۔'' (سورۃ طٰہٰ، آیت۔131)

دنیا کے پیچھے جب کوئی دوڑتا ہے تو وہ اپنی رفتار تیز کر لیتی ہے۔ رفتار حد سے بڑھ جائے تو ایک دم پلٹ کر دبوچ لیتی ہے اور سنبھلنے کا موقع نہیں دیتی۔ جو اس کی رنگینیوں سے بچنے کی کوشش کرے، اس کے پیچھے پڑ جاتی ہے، اگرچہ ہلاک نہیں کر سکتی لیکن مجروح ضرور کر دیتی ہے۔ دنیا جائز طریقے سے ملے تو بری نہیں۔ قرآنِ پاک میں اس کے لیے 'خیر' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ناپسندیدگی کا عمل وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں دین اور دنیا میں توازن نہ رہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے

لوگوں کو سخت ناپسند فرماتے ہیں جن کے دلوں میں اس کی محبت سے کسی اور چیز کی محبت تجاوز کر جائے یعنی اپنے آپ کو کسی چیز کا اس حد تک عادی بنا لے کہ پھر اس کے بغیر رہ نہ پائے۔ یہ عادت اس شے کا غلام بنا دیتی ہے جبکہ انسان کو صرف اپنے رب کی غلامی کرنی چاہیئے۔ مالک کی رضا اس میں ہے کہ جو کچھ محنت سے مل جائے، اس پر شکر بجالائے اور نہ ملے تو صبر اور تقویٰ اختیار کرے۔

غفلت کی مٹھاس کا بڑا سخت نشہ ہوتا ہے۔ اس سے چھٹکارا پانے کے لیے ضروری ہے کہ بندہ اپنا جائزہ خود لے کیونکہ یہ معاملہ غلام اور مالک کے درمیان ہے۔ ہمارے اندر کیا چل رہا ہے، اگر صراطِ مستقیم سے بھٹک گئے ہیں تو ایسا کون سا عمل سرزد ہوا ہے جس کی سزا میں یہ کیفیت ہوگئی یا پھر کوئی امتحان ہے جس میں پاس ہونا ضروری ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس کی طرف چلنا خود کو پڑتا ہے۔ فرض کو شوق و محبت سے ادا کرنا ہے، سر سے نہیں اُتارنا۔

بندہ غیر اللہ کے سامنے سوال کرنے سے کترانے لگے تو اللہ تعالیٰ اس کی تمام مرادیں پوری کرتا ہے۔ کسی کو اپنی داستانِ غم سنانا محض شکوہ وگلہ ہے، یہ برائی عادتاً شروع ہوتی ہے اور پختہ عادتیں مجبوریاں بن جاتی ہیں اور پھر مجبوریوں کے جال سے نکلنا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایسی عادتوں والے لوگوں کا اللہ پر توکل کم اور مخلوق پر بڑھ جاتا ہے۔ مخلوق ان کی توقع پر پورا نہیں اترتی جس کے نتیجے میں نفرتیں پریشانیاں پھیلتی ہیں، دلوں میں دراڑیں پڑتی ہیں اور روحانی، ذہنی اور جسمانی بیماریاں لاحق ہوتی ہیں۔

اس کے برعکس تقویٰ اختیار کرنیوالے کیلئے مالکِ حقیقی فرماتے ہیں کہ اب مجھ پر واجب ہوگیا ہے کہ میں تیرے دل کو غِنا سے بھر دوں۔

واللہ اعلم۔

11 ستمبر 2017ء

قلبِ سقیم

مالک الملک نے قرآنِ پاک کو انسان کے لیے دستورِ حیات بنا کر اس کے مطابق زندگی گزارنے کا حکم دیا اور انسانی بقاۓ حیات کے لیے تمام تر مسائل کے حل قرآنِ پاک میں بتا دیے۔ جہاں ذکرِ امراض ہے، وہاں علاج بھی موجود ہے۔ دورِ جدید میں ترقی یافتہ سائنس ابھی بہت سے امراضِ قلب کی تشخیص کرنے میں ناکام ہے۔ ربِ کائنات نے انسان کو قلبِ سلیم دے کر پیدا کیا لیکن جب انسان دنیائے فانی کی محبتوں میں الجھتا ہے، اس کے اثرات دل پر اثر انداز ہونے لگتے ہیں، بروقت علاج نہیں ہوتا تو بیماری بڑھتی چلی جاتی ہے اور قلبِ سلیم قلبِ سقیم میں بدل جاتا ہے یعنی بیمار دل ...... جن بیماریوں کی ٹیسٹ میں تشخیص نہیں ہو پاتی، انہیں ہم مرض ہی نہیں سمجھتے مثلاً کس کے دل میں حسد کا کیا ٹیسٹ ہوگا؟ کس کے دل میں نفرت کی آگ جل رہی ہے؟ کسی کے دل میں انتقام کا جذبہ عروج پر ہے؟ اس طرح کے دل بھی صحت مند و توانا نہیں ہو سکتے جن کا ذکر حقِ باری تعالیٰ نے قرآنِ مجید و فرقانِ حمید میں اس طرح فرمایا:

ترجمہ: ''ان کے دلوں میں مرض ہے، پس بڑھایا اللہ نے ان کا مرض اور واسطے ان کے عذاب ہے درد دینے والا بہ سبب اس کے کہ تھے وہ جھوٹ بولتے۔''

(سورۃ البقرہ۔ آیت: 10)

اس سے ثابت ہوا کہ کچھ بیماریاں دل میں ہی جنم لے کر، دل میں پرورش پا کر، دل کی مکین ہو جاتی ہیں۔ اب ایمان کا مسکن بھی دل ہے۔ اس طرح دونوں ایک ہی جگہ پروان چڑھیں تو ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا لازمی ہے۔ اس کی مثال کچھ اس طرح ہے کہ جیسے کوئی کسان گندم اُگاتا ہے اور اس میں کئی اقسام کی خودرو جڑی بوٹیاں اُگ آتی ہیں۔ اگر ان کا سدِباب نہ کیا جائے تو زمین سے خوراک کا ایک بڑا حصہ جذب کر کے گندم کے پودے کو کمزور کر دیتی ہیں۔

جس طرح گندم کی حفاظت کے لیے ان فالتو پودوں کا کھیت سے اخراج ضروری ہو جاتا ہے، اس طرح ایمان کی مضبوطی کے لیے ان امراض کا خاتمہ ضروری ہے۔ ورنہ طرح طرح کے فاسق اور زہر آلود خیالات کے صحیفے دل و دماغ پر نازل ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور حد سے تجاوز کرنے پر امراضِ قلب کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ جب دل ہی بیمار ہوگا، جس کا کام وجودِ انسانی کو خون کی سپلائی بہم پہنچانا ہے، تو مختلف اقسام کے روحانی ذہنی اور جسمانی امراض پیدا ہوں گے۔ ان میں سے جسم جب کسی بھی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے، ہم صرف جسمانی بیماری تشخیص کرواتے ہیں، روحانی مرض کا انکشاف نہ ہونے پر کسی ماہرِ نفسیات کے پاس نہیں جائیں گے اور نہ ہی ماہرِ ذہنی امراض سے رابطہ کریں گے کیونکہ اسے باعثِ شرم سمجھا جاتا ہے۔ اگر اپنی نظر سے دیکھیں تو اس میں کوئی برائی نہیں۔ دماغ بھی جسم کا حصہ ہوتا ہے۔ باقی وجود بیماری کی زد میں آ سکتا ہے تو دماغ کیوں نہیں...... لیکن ہم معاشرے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ معاشرہ کسی ٹھیک کام کو ناشائستہ سمجھنے لگے تو اسے برا ہی سمجھنے لگتے ہیں۔

اب اس عینک کو اتار پھینکنے کی ضرورت ہے جس سے عکس دھندلا جائیں، خیالات بے قابو ہو کر ذہنی انتشار کا سبب بنتے ہیں، جسے بے چینی (Frustration)، جارحیت (Aggression)، کشیدگی (Tension) اور افسردگی (Despression) کی ابتدا ہوتی ہے۔ جانے کیوں لوگ ان کے علاج سے گھبراتے ہیں۔ یہی معاملہ روحانیت کا ہے۔ اسے جادو، ٹونہ یا پھر جنات سمجھا جاتا ہے۔ عمومی طور پر کم تعلیم یافتہ اور پسماندہ طبقہ اس کا شکار ہوتا ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ کیا جنات بھی پولیس کی طرح صاحبِ حیثیت اور عقل و شعور رکھنے والوں سے ڈرتے ہیں؟ کسی درخت کے کٹنے سے ان کے بچے مر جاتے ہیں اور انتقامی کارروائی کرتے ہوئے لوگوں کو چمٹ جاتے ہیں۔ ان کے بچوں کی ذمہ داری انسان کی نہیں کہ اسے بدلہ لیا جائے۔ کیا یہ مخلوق صرف برِصغیر میں پائی جاتی ہے؟ یورپی ممالک جہاں جنگلات کے جنگلات نذرِ آتش ہو جاتے ہیں، وہاں ان کے بچے کیوں نہیں مرتے؟ اس طرح کی من گھڑت کہانیوں نے ہمارے کلچر میں جگہ بنا لی ہے اور کچھ منافرت پھیلانے والے موقع پرست، جن کا معاشرے میں کوئی خاص مقام نہیں ہوتا، سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے جہاں کہیں کوئی بیمار اور ضعیف العقل دیکھتے ہیں، مشورہ مفت لے کر پہنچ جاتے ہیں۔ مریض اپنے کمزور عقائد اور امراض میں مسلسل مبتلا رہنے کی وجہ سے اعصابی

طور پر ناتواں ہو جاتے ہیں۔ وہ ان کا شکار ہو کر فوراً یقین کر لیتے ہیں۔ اس طرح صحیح سمت سے ہٹ کر غلط راستے کا انتخاب اضافۂ مرض کا سبب بنتا ہے۔ وہ ہدایت کے لیے اللہ سے مدد نہیں مانگتے پھر افاقہ کیسے ہو گا؟ اب امراضِ قلب کی طرف آتے ہیں۔ دل کے والو بند ہو جانا، شریانیوں کا سکڑ جانا، دل کا بڑھ جانا یا سکڑ جانا، قلب میں سوراخ ہو جانا، صحیح کام نہ کرنا، ان وجوہات سے جسم کو موت آجاتی ہے۔ بالکل اسی طرح روحانی مسائل کی زیادتی سے روح کو موت آجاتی ہے یعنی ان کا خاتمہ ایمان پر نہ ہو گا۔ نصیحت سن کر عمل نہ کرنا قلبِ سقیم کی علامت ہے۔ دل کو جب نصیحت سننا ہی برا لگے، گناہ کرتے ہوئے جھجک محسوس نہ ہو بلکہ مطمئن رہے تو یہ قلبی موت کی علامت ہے۔

روحانی امراض سے بچنے کے لیے ہمیں چند بنیادی امور سے پرہیز کرنا ہو گا۔ فضول النظری سے بچنے کے لیے اپنی نظر فحاشی اور برائی سے چرانا ہو گی تا کہ اس قسم کے خیالات دہلیزِ دل پر دستک ہی نہ دے سکیں۔ فضول الکلامی سے پہلے یہ سوچ لینا چاہئے کہ زبان بھی اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کا استعمال سوچ سمجھ کر اور اچھے مقاصد کے لیے کرنا چاہئے ورنہ اللہ کے ذکر پر لگا دیں۔ غلط مشورہ دینے سے چپ رہنا قدرے بہتر ہے۔ فضول الطعامی سے بچنا۔ خوراک ہماری بنیادی ضروریات میں سے ایک ضرورت ہے جس کو پورا کیے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے لیکن اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ منہ کو ہر وقت ہی مصروف رکھا جائے۔ کبھی یہ کھا کبھی، وہ کھا...... اور اپنی خوراک کا حلال ہونا بھی ضروری ہے۔ حرام اور مکروہ کے علاوہ دوسروں کا حق کھانے اور ضرورت سے زیادہ کھانے کی ممانعت ہے۔ حکمت کی رُو سے کھانا چاہیے۔ زندہ رہنے کے لیے کھایا جاتا ہے جبکہ کچھ لوگ محض کھانے کے لیے زندہ ہیں۔ یہ چیزیں انسانی صحت کے لیے نقصان کا باعث بنتی ہیں۔ قلبِ میت اللہ کے ذکر سے دوبارہ حیات پاتا ہے۔ بس انسان اگر صدقِ دل سے توبہ کر لے اور اللہ کی طرف رجوع کرے تو وہ اپنی پناہ میں لے لیتا ہے اور جو اس کے خلاف کرے گا، اس کے لیے عذابِ عظیم ہے...... اس کے کلام کو جھٹلانے والوں کا کیا حال ہو گا؟ اس کے لیے ایک حدیثِ پاک ہے۔

سرورِ کونین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو پیاز کھا کر مسجد آنے سے منع فرمایا کیونکہ اس کی بُو سے فرشتوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ جھوٹ بولنے والے شخص سے اتنی بو آتی ہے کہ فرشتے کئی

میل دور بھاگ جاتے ہیں۔ایسی بیماریوں میں مبتلا انسان کا علاج کس ڈاکٹر کے پاس ہوگا؟اس کے پاس جس نے کلام اللہ کو پڑھا، اسے سمجھا، عمل کیا اور دوسروں تک پہنچایا۔ ہر صاحبِ عقل پر فرض ہے کہ سوچ سمجھ کر پڑھے اور دوسروں تک پہنچائے تا کہ صراطِ مستقیم پر چل کر قلبِ سلیم کے ساتھ واپس لوٹ کر آئے۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے وہ خسارے میں ہیں۔اسد اللہ غالبؔ نے ان کے لیے کیا خوب کہا:

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

ایک خوبصورت دل ہزار خوبصورت چہروں سے بہتر ہوتا ہے۔اس لیے ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کرو جن کا قلب چہرے سے حسین ہو جبکہ قلب و روح کی خوبصورتی تقویٰ ہے۔

15 ستمبر 2017ء

کیا یہی انصاف ہے؟

اللہ نے جیسے ہر انسان کو شکل وصورت میں ایک دوسرے سے مختلف بنایا، اسی طرح ذہنی سطح کے لحاظ سے بھی ہر فرد کو الگ الگ صلاحیتوں سے نوازا۔ کچھ لوگوں کو عقل وشعور دے کر گہرائی میں سوچنے کی نعمت عطا کی۔ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ شکرِ خدا کے ساتھ اس کا صحیح استعمال کریں اور ان لوگوں کو فائدہ پہنچائیں جنہیں کم درجہ دیا گیا۔ ہمارے معاشرے میں تقریباً پچھتر فیصد لوگ دوسروں کے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے زندگی گزارتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ وہ خداداد صلاحیتوں سے محروم ہیں بلکہ وہ اپنی عقل کو کسی برے وقت میں کام آنے کے لیے سنبھال کر رکھتے ہیں۔ اب یہ مشیر کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہمیشہ انصاف سے کام لے اور اپنی ذات کو الگ رکھ کر دوسروں کی فلاح اور بھلائی کا خیال رکھے۔ اگر ہم اپنے گردونواح میں نظر ڈالیں تو ایسے لوگ بھی نظر آئیں گے جو بہت سی خداداد صلاحیتوں کے مالک ہونے کے باوجود نہ کچھ کر پاتے نہ کچھ بن سکے ہیں۔ اس کے برعکس کچھ پسماندہ ذہن لوگ شہرۂ آفاق بلندیوں کو چھو لیتے ہیں۔ اس کا محرک کیا ہے؟ ایسا کیوں اور کہاں ہوتا ہے؟ ہر معاشرہ اخلاقیات کے مختلف قواعد وضوابط کا پابند ہوتا ہے جو اس کی مذہبی حدود کے تناظر میں مرتب کیے جاتے ہیں۔ عدل مہذب معاشرے میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے جس کے بغیر قانون سازی ممکن نہیں۔ عدل سے مراد ہر شخص سے بلا تفریق حسنِ سلوک جس کا وہ مستحق ہے۔ جو ریاست عوام کو انصاف فراہم کرنے میں ناکام ہو جائے، یقینی زوال اس کا مقدر ٹھہرے گا۔ قرآنِ مجید میں عدل وانصاف کی فراہمی پر بہت زور دیا گیا ہے کیونکہ اس میں دین اور دنیا کی فلاح ہے:

ترجمہ: ''بے شک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔''

(سورۃ النحل۔ آیت 90)

ترجمہ: ''اور جب بات کرو انصاف کرو اگرچہ کوئی قرابت دار ہی کیوں نہ ہو اور اللہ کا قول پورا کرو یہ وہ باتیں ہیں جن کا تم کو اللہ نے حکم دیا ہے اس لیے کہ تم کو

نصیحت ہو۔" (سورۃ الانعام۔آیت:15)

یہ رہنمائی صرف مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ اللہ تعالیٰ کے احکامات کی روشنی میں ایک طاقتور معاشرے کی بنیاد رکھ سکتے ہیں۔ سمجھداری، بردباری اور سوجھ بوجھ، یہ سب اوصاف عدل وانصاف میں ہی کام کرتے ہیں۔ کسی کی امارت سے مرعوب ہوکر یا کسی کی غربت پر ترس کھا کر انصاف کا دامن چھوڑنے کی اجازت نہیں۔ تاریخ کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ طاقتور ریاستوں کے زوال کی وجہ ناانصافی ہے۔ جہاں عدل کا گلا گھونٹا جائے وہاں ظلم جنم لیتا ہے اور ظلم کے کھنڈرات سے ایسی تہذیب زندہ ہوتی ہے جو عدل سے اپنا وجود قائم رکھ سکے۔ یہ ملکی سطح سے لے کر خاندانی اور خاندانی سطح سے لے کر فردِ واحد تک کی ضرورت ہے۔ اس کا اطلاق ہر ادارے پر ہوتا ہے مثلاً سکول، کالج اور یونیورسٹی میں داخلے کے وقت باقاعدہ میرٹ بنتا ہے، اسی طرح کسی ادارے میں ملازمین کے انتخاب کے لیے اس پوسٹ کے مطابق تعلیمی قابلیت درکار ہوتی ہے اور اس معیار پر پورا اترنے والے ہی رجوع کر سکتے ہیں۔ اچھے اداروں میں داخلے کے لیے یا بڑی پوسٹ کے لیے مقابلے کا ایک امتحان ہوتا ہے جس کو پاس کرنے کے بعد ایک اور مرحلہ انٹرویو کا آتا ہے۔ اس طرح ہزاروں کی تعداد میں سے صرف چند لوگ ہی کامیاب ہوتے ہیں۔

سوچنے کی بات ہے کہ اگر میرٹ ختم کر دیا جائے تو پھر کیسے انتخاب ہو سکے گا کہ کون ذہنی طور پر کس عہدے کے قابل ہے؟ ایک سی ایس ایس آفیسر 25 سے 28 سال کی انتھک محنت کے بعد مقابلے کا امتحان پاس کرتا ہے، وہ بھی سینکڑوں ذہین ترین لوگوں میں سے ایک اس مقام پر پہنچتا ہے۔ اب اس خاص ترین انسان کی ڈیوٹی کیا ہے؟ کسی ایسے شخص کی حفاظت اور اس کا حکم بجالانا جو خود پی سی ایس کا امتحان پاس کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اسے اپنے خیالات کی نقاب کشائی کے لیے کسی ماہرِ لسانیات سے مدد حاصل کرنا پڑتی ہے۔ اپنے جذبات کو الفاظ تک نہیں دے سکتا۔ اپنے خطاب کا خود مطلب نہیں جانتا۔ قارئین کی سمجھ میں آچکا ہوگا کہ ذکر یقیناً کسی وزیر کا ہے جس کے پیچھے افسر اس طرح کھڑے ہوتے ہیں:

رات محفل میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

اب آئیں سیاست کے میدان میں۔ کوئی امتحان نہیں، کوئی ٹیسٹ نہیں، ترجیحات نہیں، جس کی

لاٹھی اس کی بھینس'۔ یہ ہمارے ملک کی جمہوریت کو چلانے والے ہیں۔ کیا یہ ملک اتنا غیر اہم ہے کہ اسے کوئی بھی چلا سکتا ہے؟ کیا یہ ملک چند لوگوں کی وراثت ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر اس کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان کیوں؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کے ہاتھ میں ملک وقوم کی باگ ڈور ہوتی ہے۔ کسی بھی عمل کے لیے علم کا ہونا لازمی ہے۔ اب سوچنا ہے کہ ان حالات کو کیسے بدلا جائے۔ جب تک اس موضوع پر بات نہیں ہوگی، یہ مسئلہ جوں کا توں رہے گا۔ کسی کو ہمت کر کے آگے آنا پڑے گا۔ ان ضدی روایات سے لڑنا پڑے گا۔ لیکن پہلے اس کی ضرورت محسوس کی جائے تبھی تبدیلی کے لیے آواز اٹھائی جائے گی۔ بھکاریوں کی طرح بھیک مانگ کر ووٹ اکٹھا کرنے والے نشست جیتنے کے بعد اتنے خاص ہو جاتے ہیں کہ ملک کا آدھا بجٹ ان کی حفاظت اور پروٹوکول پر ضائع کر دیا جاتا ہے۔ جو اپنی حفاظت نہیں کر سکتا، اس نے ملک کیا چلانا ہے؟ سیاست دان کا بیٹا ہی سیاست میں کیوں آتا ہے؟ یہ کیسی جمہوریت ہے؟ ان کے لیے میرٹ، مقابلے کا امتحان اور انٹرویو ہونے چاہئیں۔ سیاست میں بھی عدل وانصاف کا اطلاق ہونا چاہئے۔ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں اختیار دینا جو اس کے اہل نہ ہوں، اپنے آپ پر ظلم کرنے کے مترادِف ہے کیونکہ بیوقوف کے ہاتھ میں طاقت دینا اپنے ساتھ زیادتی ہے۔ احمق کو اختیار مل جائے تو دہری مصیبت۔

پاکستان کے نام پر خطۂ زمین حاصل کرنے میں کامیاب تو ہو گئے لیکن ذہن ابھی تک غلامانہ ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں کے باسیوں کے دماغوں پر ہنوز برطانوی حکمرانوں کا راج ہے۔ غیر مسلم ممالک کے قوانین کا بغور جائزہ لیں تو عدل وانصاف کے لحاظ سے ریاستِ مدینہ کی سی معاشرتی آزادی ہر انسان کو دی جاتی ہے۔ اس کے حقوق کا پورا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ مگر ہمارا پیارا ملک، جو اسی مقصد کیلئے لاکھوں جانوں کی قربانی دے کر حاصل کیا گیا، اس میں بظاہر تو اسلامی علم کا پرچار بہت ہے، جگہ جگہ مساجد و مدارس اور خطیب ومعلم مل جائیں گے، مگر نہیں ملے گا تو بس عمل۔ کیونکہ اس میں ہم مادر پدر آزاد ہیں۔ بادشاہت سے بھی گیا گزرا قانون ہے۔ امیر کیلئے الگ اور غریب کیلئے الگ۔ کیا یہی انصاف ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنی عقل کو استعمال کرنا ترک کر چکے ہیں۔ بلند و بانگ دعوے کرنا ہی سمجھداری نہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو سمجھنا عقل مندی ہے۔ قوم کو اب خوابِ غفلت سے بیدار ہو جانا چاہئے اور ہمیں معاشرتی نظام کی نئے سرے سے بنیاد رکھنا ہوگی، تبھی مثبت تبدیلی لانا ممکن ہو سکے گا۔

5 نومبر 2017ء

گھاٹے کا سودا

حضرت آدم علیہ السلام کرۂ ارض پر پہلے انسان اور اللہ کے پہلے پیغمبر تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کے مطابق گزاری اور اپنی اولاد کو یہی درس دیا۔ ایک مدت تک اولادِ آدم راہِ راست پر قائم رہی پھر آہستہ آہستہ اپنے جدِ امجد کے نقشِ قدم کو بھولنے لگی تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے پیغمبروں کو مبعوث کرنے کا سلسلہ جاری کر دیا جن کی وجہ سے کچھ لوگ ہدایت پاتے اور کچھ بھٹکتے رہتے۔ اس طرح گروہ بندیاں وجود میں آئیں۔ صراطِ مستقیم سے ہٹنے والے نفع ونقصان کا ادراک بھول گئے۔ ورنہ ایسا کون ہے جو تھوڑے سے فائدے کے لیے بڑا نقصان اٹھائے۔ ظاہر ہے وہی جو سمجھ سے عاری ہو، اچھائی اور برائی کے درمیان امتیاز نہ کر سکے یا دل خوفِ خدا سے خالی ہو۔ اس دنیائے فانی میں رہتے ہوئے ہم سے دو طرح کے افعال سرزد ہوتے ہیں۔ ایک جو قرآن وسنت کے مطابق ہوں، ان پر ثابت قدم رہنا فرض ہے، وہ جائز کہلاتے ہیں۔ اس راستے پر مشکلات بہت آتی ہیں مگر جن کا ایمان کامل ہو، اللہ پر پورا بھروسہ ہو کہ وہ کبھی تنہا نہیں چھوڑے گا اور اس کی مدد ہمیشہ ساتھ رہے گی، وہ صراطِ مستقیم کو کسی صورت نہیں چھوڑتے۔ اگرچہ وقتی طور پر تنگی ومصائب کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے مگر وہ اس سے دل برداشتہ نہیں ہوتے کیونکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ اس دنیا کی حیثیت مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں۔ لہٰذا اس حقیر سی چیز کا زیاں کوئی معنی نہیں رکھتا۔

انسان دنیا میں جس کمائی کے لیے آیا ہے، وہ اعمالِ صالحہ ہیں اور یہی اعمال آخرت میں اس کی کامیابی کا ذریعہ ہیں۔ دوسری قسم ان اعمال پر مشتمل ہے جن میں نفع کم اور نقصان زیادہ ہے اور ان کو ناجائز کہا جاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ”فائدہ ہے تھوڑا سا اور واسطے ان کے عذاب ہے درد دینے والا۔“

(سورۃ النحل۔ آیت 117)

دنیائے فانی کی زندگی چونکہ مختصر ہے، اس لیے فائدہ کم ہی ہوتا ہے۔ قلیل مدت میں کتنا نفع حاصل ہوسکتا ہے، یہ صرف وہ لوگ جان سکتے ہیں جو اللہ کی رضا کو اپنی ذات وخواہشات پر ترجیح دیتے ہیں۔ ہماری تمنائیں اصل میں زنجیریں ہیں جنہوں نے گناہوں میں مقید کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد پیدا کیا پر اس نے خود کو زمانے کی رسموں سے جکڑ لیا۔ جس نے اپنے آپ پر قابو پالیا اس نے گویا برائی سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ جب تک خواہشات کی کشتی اپنی ذات کے سمندر میں ڈوب نہیں جاتی معرفتِ الٰہی کا حصول ممکن نہیں۔ اپنے عیب کا نظر نہ آنا بھی گمراہی ہے کیونکہ پھر انسان کو اپنے اعمال کا علم نہیں ہوتا۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کسی کو ہدایت کی طرف بلائے تو سب سے پہلے اسے اپنے نفس کی خطائیں نظر آتی ہیں۔ جب کوئی راہِ حق پر گامزن ہوتا ہے تو اس کا ضمیر ملامت کر کے اس کی توجہ انکساری کی طرف راغب کراتا ہے۔ تب دنیاوی طمع، لالچ اور شان وشوکت اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ وہ صرف اللہ کی نظر میں ایک خالص بندہ بننا چاہتا ہے۔ مالکِ حقیقی کی رضا کو اپنے اور اہل وعیال پر مقدم رکھتا ہے۔ اسی کا نام تسلیم ورضا ہے۔ ہر جاندار کا رزق پہلے سے ہی لکھا جاچکا ہے۔ وہ ہر حال میں اسے مل کر رہے گا۔ پھر بھی انسان اس کی فکر میں لگا ہے۔ یہ بے یقینی اسے چین سے رہنے نہیں دیتی۔ وہ نہیں جانتا کہ جب بندہ حقِ تعالیٰ کا فرمانبردار ہو جاتا ہے تو خصوصی طور پر رحمت کے سائے میں رہتا ہے۔ یہ مال واسباب اور دنیا کی چیزیں ناپائیدار ہیں۔ ان سے انسان کو آزمایا جاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ''البتہ ہم تم کو کچھ ڈر کچھ بھوک کچھ مال وجان کچھ پھلوں کے نقصان سے آزمائیں گے اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دیں۔''

(سورۃ البقرہ، آیت 155)

اس حقیقت کو سب مانتے ہیں کہ قرآنِ مجید فرقانِ حمید کا ایک ایک لفظ سچ ہے۔ پھر ان چیزوں کے نقصان پر ہم کیوں اتنا افسردہ ہوتے ہیں؟ اس کو آزمائش نہیں مانتے۔ سامانِ دنیا کے پیچھے پڑ کر اپنی آخرت برباد کرتے ہیں۔ یہ چیزیں ہمارے لیے امتحان ہیں جس پر ثابت قدم رہ کر صبر کرنے والوں میں اپنا نام لکھوانا اور مالکِ حقیقی سے انعام پانا ہے۔ اس لیے خوش خبری ہے ان لوگوں کے لیے...... لیکن ہم اس وعدے کو بھول کر بہت بڑے گھاٹے کا سودا کرتے ہیں۔ صبر کا دامن چھوڑ کر چند روزہ تسکین کی خاطر دائمی خوشی کا سودا کر بیٹھتے ہیں۔ اس کی مثال میرے خیال

میں کچھ ایسے ہی ہے۔

سودا یہ آج ہم نے سرِ عام کر دیا
خوشیوں کو غم خرید کے نیلام کر دیا

مومن ہر پل اللہ کو منانے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے۔ یہ اضطراب کبھی رکتا نہیں۔اس کی سانسوں میں دھڑکن کی طرح جاری رہتا ہے مگر آج کا انسان بندگی بھول کر قرآن و سنت سے دوری کی وجہ سے اندھیروں میں بھٹکتا پھر رہا ہے۔ جو راستہ فلاح و بھلائی کی طرف جاتا ہو اگر وہ اختیار کیا جائے، ان اصول و قوانین پر عمل پیرا ہو کر بنی نوع انسان کامیابی سے ہم کنار ہو سکتے ہیں۔جس مشکل میں ہم آج پھنس چکے ہیں، اس کا ذمہ دار کون ہے؟ ہم خود ہیں، کوئی دوسرا نہیں۔ اپنا طرزِ زندگی دیکھیں۔ کتنی مصنوعی ہے۔ یہ سب ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اپنے تعلیمی، ثقافتی، تجارتی، معاشی اور معاشرتی انداز کو بدل کر ہم مشکلات سے نجات حاصل کر سکتے ہیں لیکن سب سے پہلے اپنی سوچ بدلنا پڑے گا۔ اپنی عادات و اطوار بدلنا ہوں گے۔ اپنے بارے خود سوچنا پڑے گا۔ اپنی کمزوری دنیا کو بنا لیا ہے بلکہ کمزور وہ ہوتا ہے جس کا اپنی ذات اور نفس پر غلبہ نہیں۔ جب یہ دونوں چیزیں انسان کے بس میں ہوں، وہ جس طرح چاہے ان کا استعمال کرے، ورنہ تو پھر دولت کے انبار بھی اس کے لیے ناکافی ہیں کیونکہ حرص اس کے دل، نظر اور نیت میں ہوتا ہے۔ نیت کا لالچ بڑھتا رہتا ہے۔ امیر ہونے کا ایک آسان سا کلیہ ہے۔ ہم مسلمان ہیں، ہمارا مذہب اسلام ہے، اسلامی کلچر ہی ہمارا کلچر اور ہماری تہذیب ہے۔ طمع و لالچ دل سے نکال کر تقویٰ کی طرف آئیں۔ اللہ کا قرب سب سے زیادہ اپنے نفس کی مخالفت میں ملتا ہے کیونکہ تزکیۂ نفس پہاڑ کھودنے کے برابر ہے۔ اس لیے اس کا بدلہ اللہ کی طرف سے اجرِ عظیم ہے۔ پس صبر میں اجر ہے۔ عمل نہ کرنے والوں کے لیے ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ ''بے شک انسان خسارے میں ہے'' ......اللہ کے ایک برگزیدہ بندے سے کسی نے پوچھا کہ زندگی کیسی گزر رہی ہے؟ انہوں نے کہا کہ جب وہ دیتا ہے تو اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں اور جب نہیں دیتا تو اس کی حکمت سمجھ کر اس کی رضا کے لیے صبر کرتے ہیں۔ کیا ہم نے کبھی حکمت کی بات کی کہ ہماری عقل اس حد تک نہیں پہنچ پاتی ورنہ اس کے ہر کام میں انسان کے لیے بھلائی ہے۔

20 نومبر 2017ء

توجہ طلب مسئلہ

دورِ حاضر کا ہر انسان ملکی حالات سے باخبر رہنا چاہتا ہے۔ یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ قوم کو ارضِ پاک میں اتنی دلچسپی پیدا ہوئی کہ اپنی ذات سے نکل کر ملکی سطح پر سوچنے کی فرصت اور ضرورت محسوس کی۔ اس پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ تبدیلی آ نہیں رہی، تبدیلی آ چکی ہے۔ دیر سے آئی مگر درست آئی۔ لیکن قابلِ ذکر بات یہ کہ اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟ ماضی میں کوئی سنسنی خیز خبر سننے کو ملتی تو باعثِ توجہ اس لیے نہ بن پاتی کہ چند دنوں کے بعد دب جائے گی۔ اب ایکشن سے زیادہ ری ایکشن لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرواتا ہے کہ اگلا لائحہ عمل کیا ہوگا؟ اس تجسس نے زندگی کی کہانی میں جان ڈال دی اور اس کا سہرا عدلیہ کے آزادانہ فیصلوں کے سر ہے۔ جب منصف ایماندار ہوگا تو ہر فیصلہ قابلِ قبول ہوگا۔ جہاں کسی کے ساتھ بے انصافی ہونے لگے، انہیں یقین ہوتا ہے کہ چیف جسٹس سے ضرور انصاف ملے گا اگر ان تک پہنچ پائے تو۔ ملکی قوانین میں تبدیلی پر غور و خوض ہو رہا ہے۔ کوئی بھی منصوبہ ایک دن میں مکمل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی بیک وقت تمام کاموں کا آغاز ممکن ہے۔ ترتیب کے لحاظ سے جو مسئلہ زیادہ اہمیت کا حامل ہوگا، اس کو صفِ اول میں شمار کیا جائے گا۔

ہر انسان کا کوئی نہ کوئی مذہب ہوتا ہے۔ ایک مذہب رکھنے والوں کی تعداد جب بڑھ جائے تو وہ قوم کہلاتی ہے۔ قومیں اپنے لیے دستورِ حیات بناتی ہیں جو اس معاشرے کی تہذیب و ثقافت، رسم و رواج اور رہن سہن کے مطابق مذہبی حدود کے اندر رہ کر تیار کیے جاتے ہیں۔ مذہبی تعلیم دینے والوں کو اپنے اپنے مذاہب میں مخصوص نام دیے جاتے ہیں۔ دینِ اسلام میں ان کو علمائے کرام کہا جاتا ہے۔ سرورِ کونین محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا اور تمام علماء میرے دین کے وارث ہوں گے۔ اس سے ہم مقام اور مرتبے کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ پھر ان کی ذمہ داریاں اور معاشرے میں ان کا کردار کیا ہوگا، اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بہت کم

افعال ایسے ہیں جو سعی و خطا سے درست ہوتے ہیں ورنہ زندگی میں کوئی بھی عمل کرنے سے پہلے اس کا علم حاصل کرنا لازمی ہوتا ہے۔ بالکل یہی معاملہ دین کا ہے۔ اسلام سر سے لے کر پاؤں تک اللہ کی غلامی میں آنا ہے۔ کیسے آنا ہے؟ قرآن اور سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو سیکھنے سے پتہ چلے گا۔ اگر چہ ہمارے تعلیمی نظام میں اسلامیات کا مضمون لازمی ہے مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے اس کا ہم مطالعہ کرتے ہیں، سیکھتے نہیں۔ یہاں تک کہ اس خاکسار کو ایسے بھی تعلیم یافتہ ایم۔ اے (اسلامیات) سے ملنے کا اتفاق ہوا جن کو نماز ادا کرنے کا صحیح طریقہ بھی نہیں آتا۔

اس کے برعکس مساجد میں عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔ اس سے عیاں ہوا کہ امام مسجد کا رول کتنی اہمیت کا حامل ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معلم کی تعلیم کیا ہے؟ اکثر کی صرف حفظِ قرآن۔ یعنی وہ خود نہیں جانتے کہ قرآنِ پاک جس کی تعلیم وہ دے رہے ہیں، اس میں کیا لکھا ہے؟ یہ جاننے کے لیے انہیں کسی اور سے مدد لینا پڑتی ہے۔ پڑھا کیا رہے ہیں؟ سکھا کیا رہے ہیں؟ اس میں کس حد تک مطابقت ہے؟ یا تضاد؟...... وہ مکمل طور پر لاعلم...... دوسری طرف معاشرے میں سے کچھ لوگوں کا ایسے انتخاب کیا جاتا ہے جیسے دودھ سے بالائی پھر اس ذہین و فطین گروہ کو مخصوص انداز سے تعلیم و تربیت کے مراحل سے گزار کر حساس اداروں کی ذمہ داریاں سونپ دی جاتی ہیں۔ اب لمحۂ فکر یہ ہے کہ اس فہرست میں معلم اور مساجد نہیں آتیں بلکہ یہ کسی ریاستی ادارے میں نہیں آتیں۔ سب سے حساس معاملہ مذہب کا ہوتا ہے۔ چونکہ ہر خاص و عام کی زندگی کے لیے لازم ہے مگر پاکستان بننے سے لے کر اب تک اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ جس مقصد کے تحت یہ ریاست معرضِ وجود میں آئی تھی، ان نظریات سے مساجد کے معلم بے خبر اور جہاں نظریہ رٹوایا جاتا ہے، ان کا عمل کے ساتھ کم ہی واسطہ پڑتا ہے۔ اس خلیج کو عبور کرنے کے لیے کوئی درمیانی راستہ اختیار کرنا پڑے گا جو علم اور عمل کے درمیان پل کا کردار ادا کرے۔ اس پر اہم اقدام کی اشد ضرورت ہے اور وہ اسی صورت ممکن ہو سکے گا جب امام مسجد کو معاشرے میں کوئی خاص مقام دیا جائے گا۔ کیونکہ معلم مولوی بن گیا ہے جس کی تنخواہ محلے دار یا گاؤں کے زمیندار ادا کرتے ہیں۔ اس طرح مولوی کم اور ملازم زیادہ ہونے کی وجہ سے اسے مالک کے اشاروں پر بولنا پڑتا ہے جو اسے اجرت دیتے ہیں۔ ایک مسلک والا کسی دوسرے مسلک والے سے ملاقات کرتے ہوئے ڈرتا ہے کہ کہیں اس پر اپنے مسلک سے پھر جانے کا فتویٰ صادر نہ کر دیا جائے۔

نتیجتاً اس کی مسجد سے چھٹی...... مسلک نہ صرف سیکھنا پڑتا ہے بلکہ تنخواہ دینے والا طبقہ جس کے زیادہ خلاف ہو، اس کو برا بھلا بھی کہنا پڑتا ہے ورنہ روزی روٹی کا کہیں اور بندوبست کرنا ہوگا۔ اب ذرا آگے چلتے ہیں۔ گاؤں کا کلچر کچھ ایسا ہوتا ہے کہ کام کرنے والوں کو سالانہ فصل سے حصہ دیا جاتا ہے۔ امام مسجد کا حصہ بھی ان کے ساتھ نکالا جاتا ہے۔ یہ وہ پیشہ ہے جس کے لیے ہمارے دلوں میں عزت اور اس تک پہنچنے کی حسرت ہونی چاہئے تھی۔

حالات اس کے برعکس ہیں۔ اسی لیے ہمارے معاشرے کے امراء اس کو اپنانے میں شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ ان کی عدم دلچسپی کی وجہ سے یہ شعبہ مفلس طبقہ کے حصے میں آتا ہے۔ دوسری طرف وہ علماء جو قرآن وسنت کا مکمل علم رکھنے کے باوجود مصلیٰ پر قربِ حق تلاش کرنے کے لیے اپنے اردگرد قدم بوسی کرنے والوں کی باؤنڈری بنالیتے ہیں کہ اس ریڈار کے اندر کوئی گناہگار آنے نہ پائے یا دنیاوی عزت وجاہ کی غرض سے اپنے اپنے مدرسے بنا کر باعزت کاروبار کے ذریعے خوب مال ومتاع جمع کرنے میں مصروف ہیں، حقیقت میں وہ عالم کہلانے کے مستحق ہی نہیں کیونکہ جو یہ نہیں جانتا کہ علم بذاتِ خود ایک بلند مرتبہ ہے، اس سے بڑی کوئی دولت ہو نہیں سکتی، جو اس نقطے کو نہیں سمجھ سکتا، وہ غور وخوض نہیں کرسکتا، جو غور وخوض نہیں کرتا، وہ محض نقل کرتا ہے اور نقل کرنے والا عامل ہوسکتا ہے عالم نہیں۔ اس تمام بحث سے نتیجہ یہ نکلا کہ ریاست کو اپنی ذمہ داری سنبھالتے ہوئے مساجد کو رجسٹرڈ کرکے اپنی تحویل میں لے کر مدارس بنانے چاہئیں۔ اساتذہ اور علماء کی مذہبی تعلیمی قابلیت کے مطابق ان کا انتخاب کیا جائے تاکہ وہ آزادانہ طور پر قرآنِ پاک کی تعلیم دے سکیں۔ جب یہ ادارہ حکومت اپنے ہاتھ میں لے گی، تب اس میں تبدیلی آئے گی ورنہ ہر بندہ اپنے لیے مسجد بنا کر بیٹھا ہے۔ جب تک ہم قرآن وسنت کو نہیں سمجھتے، ہماری تمام تر تعلیم ادھوری ہے۔ وہ قرآن عمل کی کتاب ہے جس کو آسان فہم میں اتارا گیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ''اور تحقیق آسان کیا ہم نے قرآن کو واسطے نصیحت کے کیا ہے کوئی نصیحت پکڑنے والا۔'' (سورۃ القمر۔ آیت نمبر 17)

قرآنِ پاک چونکہ مکمل ضابطۂ حیات ہے اس کو ایک الگ مضمون کے طور پر نہیں بلکہ ہر مسلمان کے لیے اپنی زبان میں پڑھنا لازمی ہونا چاہئے، تب کہیں ہم غفلت کی جھیل میں ڈوبنے سے بچ

سکیں گے ورنہ تو پھر وہی ہوگا۔

والعصر ان الانسان لفی خسر۔

اسلام درگزر کی تعلیم دیتا ہے۔ جاہل سے بحث میں الجھنا دانش مندی نہیں۔

''واذا خاطبہم الجھلونا قالوا سلما'' (الفرقان۔63)

شدت پسندی کو کم کرنا کسی ایک انسان کے بس کی بات نہیں، اسے اوپر حکومتی سطح سے شروع کیا جائے کیونکہ کوئی بھی مسلمان عشقِ رسول ﷺ میں کسی سے پیچھے نہیں ہوتا۔ بس بات صرف اظہار کی ہوتی ہے۔ لفظوں کا انتخاب ایک جیسا نہیں ہوتا اور اندازِ تکلم جدا ہونے سے لہجے میں فرق آتا ہے۔

کہنے کو یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں لیکن یہ بہت بڑے تضاد کا باعث بنتی ہیں۔ ہم مسلمان قوم ہیں۔ ہمارا اللہ ایک، ہمارا نبی ﷺ ایک، ہمارا قرآنِ پاک ایک، کاش ہم سب بھی ایک ہو جائیں۔ کیا ہم صرف مسلمان بن کر نہیں رہ سکتے کہ آپس کے جھگڑوں اور فسادات سے نکل کر اللہ کے دشمن کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن جائیں۔

ایک حدیثِ پاک کا مفہوم کچھ ایسے ہے کہ مسلمان قوم پر کوئی کافر غالب نہیں آسکتا جب تک کہ اس قوم کا ایمان کمزور نہ ہو جائے۔ اب ہم کہاں کھڑے ہیں کبھی غور کیا؟ یہ مسئلہ بہت ہی توجہ طلب ہے۔

محترم چیف جسٹس! آپ ہی اس پر ازخود نوٹس لیں تو بہتر ہوگا۔

11 فروری 2018ء

وعدۂ ابلیس

مالکِ کائنات ربِ ذوالجلال نے جو بھی مخلوقات پیدا کیں، زندگی گزارنے کے اصول ان کی فطرت میں شامل کر دیے۔ وہ ان اصولوں کے تحت پوری زندگی گزارتے ہیں لیکن انسان اور جنات کو کچھ آزادیاں دے کر ان کے لیے حدود مقرر کر دیں کہ اگر ان کے اندر رہیں گے تو اللہ کی پسندیدہ مخلوق میں سے ہوں گے اور ان کی خلاف ورزی کرنے پر سرکش کہلائیں گے۔ یہ جاننے کے باوجود جب ابلیس کو حکمِ سجدہ ملا تو اس نے تکبر کے ساتھ حکم عدولی کی اور شیطان (حد سے نکل جانے والا) کا لقب پایا۔ پہلے سے ہی دل نفرت سے لبریز تھا، اوپر سے جنت سے نکالے جانے کا سبب آدمؑ بنے تو غصے کی آگ اور بھڑک اٹھی۔ اس نے اپنی عبادات کا صلہ مانگا جو اللہ تبارک و تعالیٰ نے دے دیا۔ اب انسان حیران ہے کہ ابلیس کو نافرمانی کے باوجود اتنی آزادی کیوں دی گئی؟ چونکہ اللہ تعالیٰ کی یہ صفت ہے وہ کسی کا احسان نہیں رکھتا، اسلیے اس نے عبادات کا صلہ اسے دے دیا۔ عزازیل کے مطلوبہ مطالبات مانے جانے کے بعد اس نے خالقِ حقیقی سے ایک وعدہ کیا کہ جس آدم کی وجہ سے مجھے نکالا جا رہا ہے، اب میں بھی ہر اُس راستے پر بیٹھوں گا جو تیری طرف جاتا ہے اور اولادِ آدم کو اس پر چلنے سے روکوں گا۔ بہت کم لوگ شکر کرنے والے رہ جائیں گے۔

سورۃ الاعراف میں کچھ ایسے آیا ہے:

> ترجمہ: ''(ابلیس نے) کہا جب تو نے مجھے گمراہ کر دیا میں بھی تیری سیدھی راہ پر ان کی تاک میں بیٹھوں گا، پھر ان کے پاس ان کے آگے سے اور ان کے پیچھے سے آؤں گا اور ان کی دائیں طرف سے اور ان کی بائیں طرف سے اور تو اکثر کو شکر گذار نہ پائے گا۔'' (سورۃ الاعراف، آیات 16/17)

اگر ہم اپنے اردگرد دیکھیں تو کیا ہمیں شیطان نظر آتا ہے؟ کیا وہ واقعی سیدھے راستے پر موجود ہے؟ اپنا وعدہ بھول چکا ہے یا وفا کر رہا ہے؟ اس پر سوچیں گے تو سب سے پہلی غلطی پہچان میں

کریں گے کہ کوئی مخصوص شکل وصورت ہوگی جیسا کہ سر پر بڑے بڑے سینگ لمبی سی ناک، باہر کو نکلے دانت، انسان کے وجود سے ملتی جلتی کوئی شے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ جنات کی جس نسل سے ابلیس کا تعلق ہے، وہ کوئی بھی شکل بدل سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے دماغ میں ایک حلیہ بنا رکھا ہے۔ اگر وہ اس طرح کی صورت میں آئے گا تو فوراً پہچانا جائے گا کہ یہی ہے ہمارا دشمن، اس سے دامن بچا کر چلنا ہے۔ اس طرح کون اس کی باتوں میں آئے گا؟ جب کوئی شکاری جال لگاتا ہے تو خود گھات میں بیٹھتا ہے کہ کہیں پرندوں کو شک نہ پڑ جائے۔ پس اسی طرح وہ بھی تاک میں رہتے ہوئے اپنا کام سرانجام دیتا ہے۔ دوست، ہمدرد اور خیر خواہ بن کر آتا ہے۔ اگرچہ اس کی پہچان بہت مشکل کام ہے لیکن پھر بھی کچھ علامات ہیں جن کی وجہ سے وہ پہچانا جاتا ہے۔ بڑی نشانی انسان اور اللہ کے درمیان فاصلہ بڑھانا ہے۔ زندگی کے جس موڑ پر بھی کوئی ایسا مشورہ ملے جس میں رب کی رضا شامل نہ ہو، سمجھ لیں کہ اس کے پیچھے وہی رہزن ہے جس کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہے اور مسجودِ ملائک ہونے کا ثبوت دینا ہے۔ وہ جس صورت میں آئے پہچاننا ہے اور اس کو یہی کہنا ہے:

ہم تجھے پہچان لیں گے چاہے تو
بھیس جتنے بھی بدل کے آئے گا

جو خیالات اور آراء میں منفی تبدیلی لائیں، وہ کون ہیں؟ دوسروں کے جذبات کو مشتعل کر کے اپنے مقاصد حاصل کرنے والے کون ہوتے ہیں؟ اپنے ارادوں کو مخفی رکھ کر دوسروں پر نفسیاتی اثرات ڈال کر احساسِ محرومی پیدا کرنے والے سب اسی شیطان کے چیلے ہیں۔

ایک عام سی مثال لیں۔ مسلمان ہونے کے ناطے اپنے اسلامی تہواروں کا جائزہ لیں۔ عید کی خریداری کے لیے رمضان کے فرضی روزے چھوڑ کر بازار جایا جاتا ہے۔ شادی بیاہ جو ایک مذہبی فریضہ ہے، چند ہفتے پہلے ہی ناچ گانا شروع ہو جاتا ہے اور ڈھولک مہندی کی رسموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والوں کو اپنا دوست سمجھا جاتا ہے۔

عقل وفہم رکھنے والا انسان ان کاموں پر داد وتحسین پیش نہیں کرے گا۔ یہاں فتنہ پیدا کرنے والوں کو سنہری موقع ملے گا جس سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے دل کھول کر اشتعال انگیزی کو ہوا دی جائے گی۔

دنیاوی مزاج سے ناواقف لوگوں کو یہ باور کروایا جائے گا کہ خوشیوں میں شرکت نہ کرنے

والے گوشۂ دل میں حسد رکھتے ہیں۔ وعدہ بھول جانے والوں کی عقل پر پردے پڑ جائیں تو اچھائی اور برائی کے درمیان امتیاز نہیں کر پاتے۔ ہمیں حقیقی اجالوں کی طرف سفر کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ سورۃ نجم کی آیت 39 میں یہی کہا گیا ہے کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ جب کوئی اس زاویے سے سوچنا چھوڑ دے تو پے در پے ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب تک برائی کو چھوڑنے کی کوشش نہیں کی جائے گی یہ ہمیں نہیں چھوڑے گی۔ یہاں ایک شفیق استاد کی نصیحت یاد آ گئی جو اس دو رُخی دنیا کے بارے میں اشعار کی شکل میں کیا کرتے تھے۔

اپنے چہروں پہ سجا کر کئی چہرے اکثر
لوگ ملتے ہیں سرِ راہ بڑے پیار کے ساتھ
چھین کر مجھ سے تبسم، فنِ رفتار مرا
گھر بلاتا ہے وہ اکثر بڑے اصرار کے ساتھ

کسی کے ہاتھ میں چھری دیکھ کر خود ہی تخمینہ لگا لیتے ہیں۔ اگر اس انسان کے بارے میں ہماری رائے مثبت ہو تو سوچیں گے کہ کیک کاٹنے کے لیے ہے اور اگر رائے منفی ہو تو یہ چھری کسی کے گلے تک جا پہنچتی ہے۔ بعض اوقات کیک میں زہر بھی ہو سکتا ہے۔ اچھائی اور برائی دونوں انسان کی ذات میں شامل ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہمیں کسی میں خامی نظر نہیں آتی اور کسی میں خوبی، ہم خود ہی بغیر تحقیق کے رائے قائم کر کے غلطی کرتے ہیں۔ انسانی نفسیات کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو قرآنِ پاک میں بیان نہ ہوا ہو۔ سورۃ الحجرات میں اس کا ذکر کچھ اس طرح ہوا ہے:

ترجمہ: ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو اگر آئے تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لے کر، پس تحقیق کر لو ایسا نہ ہو کہ ایذا پہنچاؤ تم کسی قوم کو ساتھ نادانی کے پس ہو جاؤ اوپر اس کے پر پشیمانی اٹھانے والے۔'' (سورۃ الحجرات۔ آیت 6)

اب ہم کیا کرتے ہیں؟...... تصدیق کرنے کے بجائے اس کو پھیلانے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ سب سے پہلی خبر دینے والوں میں ہمارا نام آئے۔ جب قرآنِ پاک کی الٹی سمت قدم اٹھائیں گے تو سرکش ہی کہلائیں گے۔ انسان کو بغاوت پر آمادہ کرنا ابلیس کا مقصد ہے لیکن اس سے دوستی کی پہل انسان کرتا ہے۔ اپنی خواہشات کی خاطر حق سے آنکھیں بند کرنے والے شیطان کے ہی ساتھی بن جاتے ہیں۔

5 فروری 2018ء

احسنُ التقویم

جون کی دوپہر سورج کی تمازت برداشت کرنا انسان تو کیا، سبزہ کے لیے بھی آسان نہ تھا۔اس وقت گھر سے نکلنا تو درکنار جھانکتے ہوئے بھی چہرے جھلس رہے تھے۔اچانک گاؤں کی ایک چھوٹی سی سڑک پر کالے شیشوں والی لمبی سی گاڑی نظر آئی۔اس کی رفتار زیادہ کم نہ تھی پھر بھی یہ خبر گاڑی کی رفتار سے تیز نکلی۔اس کے پہنچنے سے پہلے لوگوں کا جمِ غفیر لگ چکا تھا۔ان کے جوش و جذبے سے ایسا ظاہر ہورہا تھا جیسے اس خبر سے ابر کے ہاتھوں گرمی کی شدّت کو مات ہوئی ہو۔خوشی کی کرنیں آنکھوں سے عیاں تھیں۔اس مسرت وجنون کی مثال ایسے تھی جیسے کسی غریب کی دودن سے بھوکی بیوی سونے کی قیمت میں کمی کی خبر سن کر خوشی سے پھولے نہ سمائے۔جوں ہی یہ شخصیت سامنے آئی تو کچھ جانی پہچانی لگی۔چند ماہ پہلے عاجزی اور انکساری سے ملنے والی شخصیت کچھ بارعب اور متکبر سی لگنے لگی۔پھر بھی لوگوں نے پہچان لیا اور جو نہ پہچان پائے، وہ اِدھر اُدھر سے پوچھ کر حیران ہورہے تھے۔شہرت کا جمعہ بازار لوٹنے والے کو یہ محسوس کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی کہ پروٹوکول کس بات کا؟ کیونکہ روایت ہے کہ خدا جب حسن دیتا ہے تو نزاکت آ ہی جاتی ہے۔قدرت نے اگر نوازا ہے تو ہوا میں اڑنا حق بنتا ہے۔یہ بھول گیا کہ مجھے یہاں تک پہنچانے والے یہی لوگ ہیں۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو ذہانت وزبان اور عقل وفراست سے اس لیے نوازا کہ وہ صحیح اور غلط میں تمیز کر کے اپنی خواہشات، جذبات اور فطری رجحانات میں توازن قائم رکھ کر میانہ روی کا راستہ اپنائے اور ذہنی صحت مندی کا ثبوت دے۔صحت مند جسم میں ہی صحت مند عقل پائی جاتی ہے اور یہی عقل صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔اسی لیے قرآن پاک میں عقل کو خراب کرنے والی چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ:"(اے پیغمبر) سوال کرتے ہیں تجھ سے شراب اور جوا کیسا ہے کہہ بیچ ان دونوں کے گناہ ہے بڑا اور فائدے ہیں واسطے لوگوں کے مگر ان کا نقصان

فائدے سے بڑا ہے۔" (سورۃ البقرہ، آیت 219)

وقتی طور پر فائدہ دیکھنے والے ان کا بڑا گھاٹا بھول جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے دماغ سن کرنے سے کیا حاصل؟ کچھ عقل کو خراب کرنے والی چیزوں کے بارے میں ہم جانتے ہیں جیسے شراب، چرس، افیون، ہیروئن، تمباکو نوشی، گٹکا اور شیشہ وغیرہ۔ یہ سب ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں۔ ایک چیز سے مراد عقل کو خراب کرنے والی کیونکہ برائی کا ذکر قرآنِ پاک میں اس طرح ہے کہ اس کے قریب بھی مت جاؤ۔ یہ ساری برائی کی جڑیں ہیں۔ جب عقل خراب ہوگی تو پھر جانور اور انسان میں فرق نہیں رہے گا۔ دونوں کے درمیان امتیاز کرنے والی چیز یہی ہے۔ عقل و شعور کے کام نہ کرنے سے فرق مٹ جائے گا لیکن ایک نشہ ان سب سے زیادہ خطرناک ہے، اور وہ اقتدار کا نشہ ہے۔ ایسے لوگ جو اسلامی تعلیمات سے انحراف کرتے ہیں، ان کو زیادہ چڑھتا ہے۔ باقی عقل کو خراب کرتے ہیں۔ یہ نظر کو بھی خراب کرتا ہے۔ جس کے دماغ کو چڑھ جائے، اسے اپنا آپ کئی گنا بڑا نظر آتا ہے اور دوسرے اسی قدر چھوٹے نظر آتے ہیں۔ مطلبی لوگ ان کے سامنے مزید چھوٹے پڑ کر خوب فائدہ اٹھاتے ہیں جو دونوں صورتوں میں چھوڑ جاتے ہیں، مطلب نکل جائے تب بھی، نہ نکل پائے تب بھی...... اور انہی چڑھتے سورج کو سلام کرنے والے لوگوں کی وجہ سے یہ نشہ جواں ہوتا ہے۔ جوانی کو عدم کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

جوانی ایک نادانی ہے نادانی مسرت ہے
مسرت کے لبوں پر ہوش کی باتیں نہیں ہوتیں

انہیں اس مقام پر لانے والے ہوش کے ناخن نہیں لینے دیتے، اس طرح ترقی کی منزلیں تیزی سے طے کرنے کی دھن میں اخلاقی حدود پار کر جاتے ہیں۔ دنیاوی عزت جتنی جلدی آتی ہے، اتنی جلدی چلی جاتی ہے۔ کبھی تخت پر بٹھاتی ہے تو کبھی جوتوں سے استقبال کرتی ہے مگر دائمی عزت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ جیسے اللہ کے نبیوںؑ کی...... یا کسی درویش کی...... کیونکہ وہ مادی اشیاء سے والہانہ محبت نہیں کرتے اور نہ ہی اس سے عزت و شہرت خریدتے ہیں بلکہ یہ عطیۂ خداوندی ان کے عمل کی وجہ سے تحفہ میں ملتا ہے۔ اگرچہ اس کی رفتار دھیمی ہوتی ہے لیکن منزل تک ضرور پہنچاتی ہے اور انہی لوگوں کے لیے فرمانِ الٰہی ہے:

ترجمہ: "سن رکھو جو لوگ اللہ کے ولی ہیں نہ ان کو ڈر ہوگا نہ غم۔"

(سورة یونس، آیت:62)

کوئی انسان اکیلا نہیں بدلتا بلکہ اس کے ساتھ گھر کا سارا ماحول بدلتا ہے۔ گھر کی تبدیلی سے معاشرے تبدیل ہوتے ہیں۔ معاشرہ ریاست پر اثر انداز ہوتا ہے اور ریاست اسے قانون بناتی ہے۔ اس لیے ایک انسان جب کوئی اچھائی یا برائی کرتا ہے، تو وہ اس کی ذات تک نہیں رہتی بلکہ پھیل کر اس کا تعارف بن جاتی ہے۔ خود کو بدلنے سے کیا تبدیلی آسکتی ہے؟ علامہ محمد اقبالؒ اس طرح بیان کرتے ہیں:

تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں ہے کہ یہ چار سُو بدل جائے

دورِ حاضر کا رواج بن گیا ہے کہ ہر بندہ برائی کو حکومتِ وقت کی ایجاد قرار دے گا۔ اگر ایسا ہی ہے تو ایسے حکمرانوں کا انتخاب کیوں کرتے ہیں؟ ان کو آگے لانے والا کون ہے؟ ہم ہی ووٹ دیتے ہیں؟ کیوں اس وقت نہیں سوچتے کہ کسی برے انسان کو اقتدار سونپنا خود پر ظلم کرنے کے مترادف ہے؟ اچھائی اور برائی کو ماپنے کا معیار کیا ہے؟ ربِ کائنات نے فرمایا:

ترجمہ: ''کہہ ساتھ فضل اللہ تعالی کے اور ساتھ رحمت اس کی کے پس انہی (دونوں) پر خوش ہونا چاہئے یہ اس سے بہتر ہے جو وہ (دنیا کا مال واسباب) اکٹھا کرتے ہیں۔'' (سورة یونس، آیت 58)

ہم نے کبھی سوچا کہ فضل کیا ہے یا رحمت کیا ہے؟ کیا یہ سوچنے کے لیے کوئی قانون پاس کرنا پڑے گا؟ اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ ہماری لاعلمی پر کہ قرآن کیا کہتا ہے، نہ ہم اس کی تعلیم کے مطابق کسی کا انتخاب کرتے ہیں اور نہ اس کے مطابق ان کے ساتھ سلوک، حکمرانوں کو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مثالیں دیتے ہیں، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ جیسی عوام کو بھی یاد رکھنا ہوگا، تب موازنہ ہوگا۔ ہمارے اعمال ایسے ہیں کہ ہمیں اس طرح کے حکمران ملے۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے خزانچی سے ایک ماہ کی تنخواہ قبل از وقت مانگی تو خزانچی نے کہا کہ آپ لکھ کر دیں کہ آنے والے ماہ تک آپ زندہ رہیں گے۔ ہم میں اتنی ہمت ہے کہ اپنے گریبان میں جھانک کر دوسروں سے سوال وجواب کرسکیں یا دوسروں پر تنقید کرسکیں؟ پہلے خود کو دیکھیں۔ ہم دوسروں کے سامنے کیوں جھکتے ہیں؟ بندگی صرف اللہ تعالیٰ کی کرنی ہے پھر ہم

کیوں دنیا کے لالچ میں دوسروں کے سامنے اپنی عزت کو بھول جاتے ہیں۔ اس لیے کہ عوام میں اتحاد نہیں۔ اس بات کا علم نہیں۔ ان کو یہ شعور دینا پڑے گا۔ ہم کہتے ہیں کہ اُمراء کو سدھارنے کی ضرورت ہے جبکہ قوم کو سدھرنے کی ضرورت ہے۔ لوگوں کو کونسلنگ کی ضرورت ہے تا کہ وہ اپنا مقام پہچان سکیں کہ انہوں نے اپنا کردار کیسے ادا کرنا ہے۔ ہر بشر انتظار میں ہے کہ کوئی ایسا نظام آئے جو قرآن وسنت کے مطابق ہو۔ یہ تبھی ممکن ہے جب ہر فرد اپنا احتساب کرے گا، رجوعِ الٰہی کرے گا...... یہ سب موت کی یاد ہی کروا سکتی ہے......

''اور جنہوں نے خوف کھایا اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ان کے لیے جنت ہے۔'' (الرحمٰن) کہ انسان نے اس دنیا میں آ کر کیا کمایا، وہ سفر در سفر میں رہا، اس نے سفر کہاں سے کہاں تک کیا، اگر اس کا راستہ غلط تھا تو پھر اس نے کدھر کا سفر کیا، احسن التقویم سے اسفل السافلین کی طرف؟

20 مارچ 2018ء

مظلوم کون؟

ایک بار مجھ ناچیز کو مزدوروں کی بستی میں جانے کا اتفاق ہوا۔ بند گلی کے آخری گھر سے آنے والی آوازوں سے منہ چھپائے سناٹا کسی کونے کھدرے میں جائے پناہ ڈھونڈ رہا تھا۔ سب لوگ چوکنے ہو چکے تھے۔ جیسے گھنٹی کے بجنے پر بچوں کو نئے ٹیچر کے آنے کا انتظار ہوتا ہے۔ سب باخبر ہو گئے کہ فحش گفتگو اور دھینگا مشتی کا پروگرام شروع ہونے والا ہے۔ اس بستی کے بے تکلف ماحول میں عادت سے رونے والے بچوں کی آوازیں آنا معمول کی بات ہے۔ وہ لوگ اس چیز کے اس حد تک عادی ہو چکے ہیں کہ یہ سب انہیں اپنا کلچر لگتا ہے۔ ان کا نظریہ ہے کہ خالی پیٹ پڑھا نہیں جا سکتا۔ معدہ خالی ہو تو دماغ کام نہیں کرتا۔ مگر گالی گلوچ سیکھنے میں ان کے ذہن بڑے زرخیز ہوتے ہیں۔ خشک زمین میں بھی اخلاقیات کی پست ظرفی کے یہ خودرو پودے اُگ آتے ہیں، سبک رفتاری سے زبان کے استعمال سے جیسے گوہرِ نایاب نکلتے ہیں، یہی الفاظ ان کے جذبات، احساسات، خیالات اور ماحولیات کی نمائندگی کرتے ہوئے اردگرد کے فرسودہ ماحول کو مزید آلودہ کرنے میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔ لیکن ہر بات پر آستین چڑھا کر آپے سے باہر ہو جانا ان کے لیے باعثِ فکر نہ تھا۔ یہ محض ان کی زندگیوں کے ذاتی، صفاتی اور ظاہری کردار کا عکس تھا جسے وہ دنیا کے سٹیج پر ادا کر رہے تھے۔ ایسے لوگوں کے حالاتِ زندگی صاحبِ بصیرت کی بصارت سے حجاب اٹھا کر حسبِ توفیق معلومات فراہم کرنے کا موقع دیتے ہیں۔

ایسی بستیوں کے مزدور خون پسینہ ایک کر کے شام کو جب تھکے ہارے گھروں کو لوٹتے ہیں تو خواتین کے دن بھر کے فسادات کی داستان اس کا استقبال کرتی ہے۔ محنت مزدوری کی دشواریوں اور مشکلات کے باوجود کچھ میں اتنی سکت ہوتی ہے کہ وہ کھسیانی سی ہنسی میں سب کچھ چھپا لیں لیکن بعض کا ردِعمل اس کے برعکس ہوتا ہے۔ ان کے ہاں ''پہلے آوَ پہلے پاوَ'' کا کلیہ چلتا ہے۔ جس نے پہلے بتا دیا، وہی سچا ٹھہرا اور کچھ لوگوں نے اپنا دماغ کسی ایک نقطے پر مرکوز کیا ہوتا

ہے۔جن کے بارے میں یہ رائے ہوتی ہے کہ ہمیشہ سچ کہنے کے عادی ہیں۔وقت گزرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہی سب سے بڑے فسادی تھے۔یہ مسئلہ اب عالمی مسئلہ بن چکا ہے کہ ظالم کون ہے اور مظلوم کون؟ مرد یا عورت؟ زیادہ تر لوگوں کا جواب ہوگا عورت، جبکہ کچھ کے نزدیک مرد مظلوم ہے۔اگر ہم اپنے گردونواح کا جائزہ لیں تو ہمیں کئی خواتین ایسی بھی ملیں گی جن کے ساتھ زندگی کے ہر موڑ پر ناانصافی ضرور ہوئی ہوگی۔اگر اس سے تھوڑا آگے نکلیں کہ یہ ماجرا ہوا کیسے؟ آپ کے علم میں آئے گا کہ اکثر خواتین کے مدِ مقابل عورت ہی ہوگی، کبھی ساس اور کبھی بہو کی صورت میں، کہیں نند کی شکل میں تو کہیں بھابھی کے روپ میں، کوئی دیورانی یا جیٹھانی کی حیثیت سے بلکہ اب تو محلے داروں کا بھی ایک اہم کردار نکلتا ہے۔انہی میں مقبول ترین رشتہ ساس اور بہو کا ہے۔جب دونوں کے نام ایک ساتھ آتے ہیں تو پسِ منظر میں ایک گھمبیر سی داستان ذہن میں رقص کرنے لگتی ہے۔دراصل یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔اگر دونوں اپنی اپنی جگہ پر رہیں، اپنے لیے کوئی مقام متعین کرلیں تو یہ کردار معاشرے سے خارج ہوسکتا ہے۔ان کے درمیان وجہِ نزاع کیا ہے؟ جھگڑا کس بات کا ہے؟ اقتدار کا، حکمرانی کا یا پھر رشتے کا؟ ان دونوں کے درمیان ایک مضبوط رشتہ ہے۔ایک کا بیٹا دوسری کا سرتاج۔یہ صورت تب پیدا ہوتی ہے جب ان دونوں کی نظر میں درمیانی رشتے کا احساس ختم ہوجائے۔اگر احساس ہوتا تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔اب کون ظالم ہے اور کون مظلوم ہے، یہ دونوں تمغۂ حسن عورت کے ماتھے کا جھومر بن رہے ہیں۔مرد کیا ہے؟ کہیں خاموش تماشائی یا پھر ایک مہرہ جسے اپنی مرضی سے استعمال کیا جاسکتا ہے؟ جب کوئی سلنڈر پھٹتا ہے اور بہو کی موت ہوتی ہے، اس وقت ساس بیٹے کے پیچھے ہوتی ہے۔جب بیٹا اپنی بوڑھی عمر رسیدہ ماں کو اولڈ ہوم چھوڑ آتا ہے، اس وقت بہو شوہر کے پیچھے ہوتی ہے۔یہ تو عورت کا جھگڑا عورت سے ہوا۔وہ اپنی دشمن آپ ہے۔بقول عدمؔ:

جب میری اپنی ذات کو بھی مجھ سے بیر ہو
دنیا کے رحم کھانے کا پھر کیا سوال ہے

یہاں کوئی دوسرا کیا کرے جب جنگ ہی اپنوں میں جاری ہو۔کون مقام دلوائے گا عورت کو، انصاف کون دلوائے گا، کسی کے رحم کھانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔جیسے ریاست کی حکمرانی کا شوق مرد کے دل و دماغ میں ہوتا ہے، اسی طرح گھر کی ملکیت کا بھوت عورت کے دماغ پر سوار

ہوتا ہے۔ اکثر گھرانوں میں دیکھا گیا ہے کہ سربراہ کا کوئی منشور نہیں، اگر ہے تو اس کا اطلاق یکساں نہیں ہوتا بلکہ اس معاملے میں کچھ لوگوں کا ایک ہی اصول ہوتا ہے کہ ان کا کوئی اصول نہیں ہوتا۔ جس معاشرے میں انصاف نہ ہو، وہ حیوانیت کا معاشرہ کہلاتا ہے۔ وہاں اخلاقیات ناپید ہو جاتے ہیں۔ ماضی میں جو قومیں تباہ ہوئیں، وہ اپنی ناانصافیوں، غرور، تکبر، بداخلاقیوں اور پستیوں کی وجہ سے نیست و نابود ہوئیں۔ قرآنِ پاک میں بارہا ان کا ذکر کر کے ہمیں ڈرایا اور باخبر کیا گیا ہے کہ ان کے انجام سے سبق سیکھنے کی ضرورت ہے۔

ترجمہ: ''کہہ سیر کرو بیچ زمین کے پس دیکھو کیا انجام ہوا گنہگاروں کا۔''

(سورۃ النمل، آیت: 69)

یہاں بھی ہم مصلحت کے تحت قرآنِ پاک کی آیت کا نصف ترجمہ اپنے مطلب کا یاد کر لیتے ہیں، سیر کی حد تک ٹھیک ہے، اس سے سیکھنا کیا ہے؟ وہ یاد نہیں ہو پاتا۔ اگر ہم سوچیں کہ سابقہ اقوام کی تباہی جن نافرمانیوں کی وجہ سے ہوئی، کیا وہ سب نافرمانیاں ہم نہیں کر رہے؟ وہ لوگ بھی اپنے انبیاؑ کی تعلیم و احکامات پر عمل نہیں کرتے تھے اور یہی کہتے تھے کہ تمہاری باتیں بے بنیاد افسانے ہیں جن میں کوئی حقیقت نہیں پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیاروں کی باتوں کو سچ کر دکھایا اور سرکشوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ دنیا میں اب تک مرنے کے بعد کوئی دوبارہ واپس نہیں آیا اور ہم نہیں جانتے کہ مرنے والوں کو نیکی کی جزا یا گناہ کی سزا کیسے ملی؟ لیکن ہمارا ایمان اس بات پر پختہ ہے کہ قرآنِ کریم میں جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے کر دیا وہی سچا ہے۔ جس طرح اس نے اپنے پیغمبروں کی باتوں کو سچ کر دکھایا اور وہ قصے قرآن پاک میں ہمارے لیے محفوظ کر دیے تاکہ ہم عبرت پکڑیں اسی طرح قیامت کے بعد حساب بھی ضرور ہوگا، نیک اعمال کا بدلہ اچھا اور برے اعمال کا بدلہ سزا کی صورت میں ملے گا۔ دوسروں کو مکر و فریب کے جال میں پھنسانے والے خود پھنس چکے ہوں گے۔ اس دن یہ دنیا کی چال بازیاں ضرور یاد آئیں گی مگر کوئی مداوا نہیں ہوگا۔ جب شامت آئے گی تو کوئی بات چھوڑی نہ جائے گی جس پر ان کا سخت محاسبہ نہ ہوگا۔

معاشرے میں ہر طبقے کا اپنا فلسفۂ حیات ہوتا ہے جس میں عورت کی عزت نہیں ہوتی۔ ان مردوں کی تربیت کرنے والی عورت ہی ہوتی ہے۔ اس نے ایسی تعلیم ہی کیوں دی؟ وہ خود بھی عورت ہے، اس میں مرد کہاں ہے؟ ان سب باتوں کا ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ظلم کرنے والی اور ظلم

سہنے والی دونوں ہی ہم جنس ہیں۔ اس مشقِ سخن کو روکنے کے لیے تیسرے کردار کی اشد ضرورت ہے جوان ہم جنسوں کی بے ہنگم زندگی کو بہتر ڈھنگ سے گزارنے کا طریقہ سکھائے اور ان کے اندر احساس جگائے کہ سب رشتے لازم وملزوم اور قابل احترام ہیں۔ ہمیں گزشتہ معاشروں کی تقلید کرنا ہوگی جو ہم سے بہتر اچھی اقدار، رسم ورواج، روایات اور برتر ذہن وشعور کے مالک تھے۔ یہ تبدیلی بیک جنبشِ قلم ممکن نہیں بلکہ اس کا آغاز چھوٹے بچوں کی تعلیم وتربیت سے کرنا پڑے گا۔ انہیں رشتوں کی اہمیت سمیت معاشرے کے مؤثر قائدانہ اطوار سکھانا ہوں گے۔ خاص طور پر بچیوں کے ذہنوں سے اپنے ہم جنس کی نفرت کی جگہ محبت کا بیج بونا ہوگا۔ اس طرح مستقبل کی ظلم و زیادتی کی چکی میں پسنے والی عورت کو باوقار مقام دلا سکیں گے۔ کبھی ان کی جگہ پر خود کو رکھ کر دیکھیں، تب ہم جان پائیں گے کہ وہ بھی ہم جیسی ہی ہیں جن بچیوں کو درندگی کا نشانہ بنایا گیا ہو اور مزید ظلم یہ کہ درندے قانون کی گرفت سے بچ کر دندناتے پھرتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت کا ظلم و بربریت سے لبریز یہ قانون چودہ سو سال قبل نبی آخر الزماں ﷺ نے جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا اور انسانیت میں عورت اور مرد کو برابری کا درجہ دے دیا گیا۔ پھر یہ تبدیلی کیسی؟

22 مارچ 2018ء

ثالثی کا کردار

ایک شخص ندی کے کنارے بیٹھ کر اپنے خیالوں میں گم زندگی کے معصومانہ سوالوں کے جواب تلاش کرنے میں مگن تھا۔ حدِ نگاہ تک درختوں کی لمبی قطار خامشی کا لبادہ اوڑھے احتراماً غروبِ آفتاب کی منتظر تھی جبکہ وہ اپنی ہی سوچ میں مگن تھا کہ قدموں کی آہٹ سے یکدم چونک اٹھا۔ قریب سے گزرنے والوں کی گفتگو کے الفاظ کچھ یوں تھے ''طویل عرصے سے ہم دونوں کے درمیان رنجش تھی، اب ایک ثالث نے صلح کروادی ہے۔''

وہ اپنی سوچوں سے نکل کر ثالث کے کردار کی تلاش میں لگ گیا۔ یہ اضطراب اسے ایک اہلِ دانش کے پاس لے گیا جہاں اس نے اپنا مدعا بیان کیا۔ بابا جی نے ایک بھرپور قہقہہ لگانے کی کوشش کی لیکن اکھڑتی سانسوں نے اسے مکمل کرنے کی مہلت نہ دی۔ بابا جی نے کھانستے ہوئے سامنے ایک عمارت کی طرف اشارہ کیا اور بولے یہ کس سے بنی ہے؟ جواب ملا ''اینٹوں سے'' بابا جی بولے۔ اگر سیمنٹ یا مٹی نہ ہوتی تو کیا یہ عمارت بن پاتی؟ اس کامیابی کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟ اینٹوں کو جوڑنے والی چیز کا۔ یہ قانونِ قدرت ہے کہ اس نے دو چیزوں کو جوڑنے کیلئے تیسرے عنصر کو وجود دیا کہ وہ اسی سے جڑے گی۔ کسی اور سے نہیں مثلاً کپڑے کو سینے کے لیے سوئی اور دھاگہ ہے، وہ اسی سے سلے گا، لکڑی کو جو چیز جوڑ سکتی ہے، وہ کیل ہے لکڑی دھاگہ سے نہیں جڑ سکتی، اسی طرح کاغذ کو چپکانے کے لیے گلو ہے، وہ کیل سے نہیں چپکایا جا سکتا، بیج کو مٹی میں اُگانے والا پانی ہوتا ہے، لوہے کو لوہے سے ملانے کے لیے آگ ضروری ہے، انسان کو عقل دی کہ کسی چیز کا استعمال کیسے کرنا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہر دو چیزوں کو ملانے کے لیے تیسری موجود ہے تو دلوں کو جوڑنے والی کیا شے ہوگی؟ وہی جو اس کیلئے مختص ہے۔ وہی اسے جوڑ سکے گی۔ بس یوں سمجھئے کہ ہمارے دل صرف دینِ اسلام سے ہی جڑ سکیں گے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ''اور الفت ڈالی درمیان ان کے دلوں کے اگر خرچ کرتا تو جو کچھ بیچ زمین کے ہے سب نہ الفت ڈالتا ان کے دلوں میں لیکن اللہ نے الفت ڈالی درمیان ان کے بے شک وہ غالب ہے حکمت والا۔''

(سورۃ الانفال، آیت:63)

کسی کا دل محبت سے منور کرنا اللہ ہی کا کام ہے۔ انسان جتنا اللہ کے قریب ہوتا جائے گا، اس کا دل اللہ کی مخلوق کی طرف جھکتا جائے گا۔ یہی دلوں کے جڑنے کی نشانی ہے لیکن عمل کے لیے علم کا ہونا ضروری ہے اور علم کے لحاظ سے آج کا مسلمان دو طبقوں میں بٹ چکا ہے۔ ایک دین اور دوسرا دنیا کا جبکہ اسلام صرف علمِ نافع کا درس دیتا ہے اور مسلمان اس تقسیم کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اپنے مقصدِ حیات کو پانے میں مشکلات کا شکار ہیں۔ دورِ جدید کی تعلیم حاصل کرنے والے اپنا سارا وقت اسی علم کو دیتے ہیں اور یہی حال دینی علوم سیکھنے والوں کا ہے۔ انسان کو اپنے معاشرتی رہن سہن کیلئے جدید سائنسی و تکنیکی علوم سے آگہی بے حد اہم ہے ورنہ اسے ترقی یافتہ قوموں کے زیرِ تسلط زندگی بسر کرنا ہوگی۔ ایسا معاشرہ ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جاتا ہے جو دوسروں کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا ہے۔ ربِ کائنات نے تمام کتابوں کے علوم و معارف قرآنِ پاک میں رکھ دیے ہیں، اس لیے مسلمانوں کو قرآن مجید فرقانِ حمید پر تحقیق کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے تاکہ مدِ مقابل حریف سے اپنا مؤثر دفاع کرسکیں۔ اپنی معاشرتی، معاشی، سماجی، ثقافتی اور اخلاقی تہذیب کو اسلام کے مطابق نئی نسل کو میراث دے سکیں۔ اس نورِ حیات سے زندگیوں کو منور کریں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان ایک چھوٹا سا اسلامی مسئلہ پوچھنے کے لیے ایسے امام مسجد کے پاس جاتا ہے جسے اپنا نام لکھنا تک نہیں آتا۔ صرف قرآنِ پاک کی عربی میں تلاوت کرسکتا ہے۔ اگر ایسا انسان اسلام سیکھ سکتا ہے تو اٹھارہ بیس سال رسمی تعلیم حاصل کرنے والا کیوں نہیں؟ اور جس مسلمان کے پاس اسلام کا اتنا بھی علم نہیں، میرے خیال میں وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ کہلانے کا مستحق نہیں۔ اس کے پاس مذہب سیکھنے کے لیے وقت نہیں کہ جس سے دنیا بھی بہتر ہو جائے گی اور آخرت بھی سنور جائے گی۔ دوسری طرف ایک حافظِ قرآن لکھنے پڑھنے سے محروم کیوں؟ اسلامی تعلیم کی ڈگریاں رکھنے والے اپنے ان بھائیوں کو نظر انداز کیوں کرتے ہیں؟ اس پر سوچنے کی ضرورت ہے۔ لاکھوں روپے لگا کر مسجد تعمیر کی جا سکتی ہے مگر اس مسجد کے امام کو لکھنا پڑھنا نہیں سکھایا جاتا۔

مسلمانوں کے پاس علم کی کمی نہیں، نہ جدید علوم کی، نہ اسلامی علوم کی، ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ان دونوں کو ملا کر ان سے فائدہ کیسے اٹھانا ہے؟ ان کے درمیان تعلق کیسے پیدا کرنا ہے اگر ایسا ہو جائے تو مسلمان پوری دنیا پر غلبہ پا سکتے ہیں۔ دنیا کے نقشے پر نظر ڈالیں تو مسلمان مشکلات کا شکار اور ابتر حالت میں ملیں گے۔ اس بازار میں ان کے لیے ظلم و ستم اتنا سستا کیوں؟...... کشمیر ہو، شام ہو یا برما، ہر جگہ مسلمانوں کے لیے زمین تنگ ہے۔

دو چیزوں کو ملانے کے لیے تیسری موجود ہے، انہیں ملانے کا کردار کون ادا کرے گا؟ یہ کام تیز ترین میڈیا سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا کیونکہ پہلے ماں کی گود بچے کی اولیں درس گاہ ہوتی تھی لیکن اب میڈیا ہے۔ ادب زندگی سے تخلیق ہوتا تھا۔ زندگی میں جو بھی ہوتا، وہی ادب بنتا تھا۔ اب زندگی میڈیا سے تخلیق ہو رہی ہے۔ آج بچوں کو جو کچھ دکھایا جا رہا ہے، کل وہی ہمارے معاشرے کا حصہ بنے گا۔ انسانی معاشرت کا حسن علم ہے اور حدیثِ پاک کے حوالے سے بہترین علم نافع ہے۔ اسی نے انسان کو جانوروں کی سطح سے اٹھا کر انسانیت کی معراج تک پہنچایا۔ سیکھنے کیلئے بچے کے پہلے بارہ سال زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ اسی عمر میں تخیلات جنم لیتے ہیں اور بچہ اپنی تخیلاتی شخصیت کے ہر فعل کو اپنی ذات کا حصہ بنانا چاہتا ہے۔ اس لیے میڈیا نئی نسل کی تعمیر میں مثبت کردار ادا کرے۔ جو پروگرام دکھائے جائیں، نافع علم کا خیال رکھا جائے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی دوڑ میں آج بھی انگریز سب سے آگے ہیں اور یہ ان کی انتھک محنت کا ثمر ہے جبکہ ہمارا میڈیا نئی نسل کو ہندو ثقافت کی طرف دھکیل رہا ہے۔ چند ٹی وی چینلز کے سوا بیشتر پر ہندوانہ ثقافت اور رسم و رواج کے پرچار کی علی الصباح شروعات ہو جاتی ہے۔ آدھے سے زیادہ آبادی خواتین پر مشتمل ہے جن میں سے اکثر کی زندگی انہیں کاموں میں گزر جاتی ہے۔ خواتین کو اپنی موت کے دن کا علم نہیں ہوتا ورنہ اپنی برسی کا فنکشن بڑے دھوم دھام سے مناتیں۔ اب میڈیا کو ترتیب بدلنے کی ضرورت ہے۔ بہترین علم تو علمِ نافع ہے۔ ان علوم کا کیا فائدہ، نہ دنیا کا نہ دین کا، بلکہ دونوں کا گھاٹا۔ اب اس پر کون نوٹس لے گا؟ کون روکے گا؟ کیا یہ بھی امریکہ کی سازش ہے جس کے سامنے ہم بے بس ہیں؟۔ یہاں ثالثی کا کردار ذرائع ابلاغ کو ادا کرنا ہے۔ اس پر تمام ذمہ داران کو ازخود نوٹس لینے کی ضرورت ہے۔ ان میں مصنف، شاعر، صحافی، رپورٹر، ایڈیٹر، منتظم، پروڈیوسر، اداکار اور پروگرامز کے میزبان سبھی شامل ہیں۔

یہ ایک انسان کا مسئلہ نہیں اور نہ کسی ایک ملک یا حکومت کا مسئلہ ہے۔ یہ سیاسی موضوع بھی نہیں۔ یہ تو مسلمانوں کے ایمان کے تحفظ کا معاملہ ہے، آخرت کا، جب ہم کسی شخص سے ملتے ہیں، اس کی تربیت ہم سے بہتر ہوئی ہے یا ہماری ان سے بہتر۔ اگر ہم بہتر ہیں تو ہمیں سکھانا ہوگا لیکن اگر وہ بہتر ہیں تو ہمیں ان کی تقلید کرنے میں تامل بالکل نہیں کرنا ہوگا۔ ہم سب یہ ذمہ داری لیں تو معاشرے کا سدھار ممکن ہے۔ جس طرح باقی اہلِ مذاہب اپنے علوم کی ترویج کے لیے دن اور وقت مختص کرتے ہیں، ہمیں بھی اس پر عمل کر کے اپنا دین سیکھنا ہوگا۔ ہمیں اپنے دین کیلئے سال میں کم از کم چالیس دن تو لازمی طور پر مختص کرنا چاہئیں۔ جبکہ بعض لوگ تو اپنی تمام زندگی میں اتنا وقت اپنے دین کو نہیں دے پاتے۔ ہمیں سوچنا چاہئے تا کہ اپنے آپ کو پہچان سکیں۔ بقول علامہ محمد اقبالؒ:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن

25 مارچ 2018ء

استخارہ کیا ہے؟

انسان جب کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو ابتدائے عمل سے ہی نیت شامل ہوتی ہے۔ اگر چہ دورانِ عمل اس سے کوئی خلل پیدا ہو بھی جائے تو بندہ اس میں معذور متصور ہوتا ہے کیونکہ ارشادِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے: ''نیت المئومن خیر من عملہٖ''...... عمل میں نیت کرنا اس سے بہتر ہے کہ بغیر نیت کے عمل شروع کیا جائے۔ سب کاموں میں نیت کو عظیم مرتبہ و برہانِ صادق حاصل ہے۔ جیسی نیت ہوگی، اس کا اجر ویسا ہوگا۔ ثواب و گناہ اسی نیت پر منحصر ہیں۔ مثال کے طور پر اگر ایک شخص 16 یا 20 گھنٹے نہ کچھ کھائے نہ پئے اور بغیر نیت کیے بھوکا رہے تو یہ فاقہ کشی روزے کا ثواب نہیں پہنچا سکے گی۔ اس کے برعکس دوسرے شخص نے روزے کی نیت کی لیکن غیر ارادی طور پر غلطی سے کچھ کھا پی لیا، تب بھی اسے روزے کا اجر ضرور ملے گا۔ جب ہم کسی کام کی نیت کرتے ہیں تو اپنے علم و عقل اور فہم و بصیرت کا استعمال کرتے ہیں اور ان سب کا جو بہتر فیصلہ ہو وہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اللہ کے نیک بندے اس پر اکتفا نہیں کرتے۔ اپنی عقل کو ہمیشہ ناقص سمجھتے ہیں کیونکہ ربُ العزت نے اپنے تمام علوم میں سے 'ب' کے ایک نقطہ کا علم باقی مخلوقات کو دیا۔ پھر انسان کی سمجھ میں اس کی حکمت اور رموز کیسے آسکتے ہیں؟ اس لیے کسی جائز کام کو کرنے سے پہلے سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مطابق استخارہ کر کے اللہ جل شانہ کی بارگاہ میں دعا کر کے مشورہ لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ اللہ سے استخارہ کرنا اولادِ آدم کی خوش بختی ہے۔ ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ:

ترجمہ: ''نقصان نہیں اٹھاتا وہ شخص جو استخارہ کرتا ہے اور پشیمان نہیں ہوتا جو کوئی مشورہ کر لیتا ہے۔''

اور بعض احادیث سے یہ ثابت ہے کہ: ''من سعادۃ ابن ادم الرضاء بالقضاء'' ابنِ آدم کی سعادت مندی رضائے الٰہی پر راضی ہونا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت جابر بن عبداللہؓ سے

روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم کو تمام کاموں میں استخارہ کی تعلیم (اس تاکید سے) فرماتے، جیسا کہ سورۃ (اہتمام) کے ساتھ سکھلاتے۔ آپ فرماتے کہ جب کسی کو کسی کام میں فکر (تردد) ہو تو استخارہ کر لیا کرے۔ جس شخص نے کسی کام کے لیے استخارہ کیا اور اس میں اللہ تعالیٰ نے کوئی فیصلہ کر دیا۔ (مثلاً وہ مقصد پورا کر دیا یا اس سے دل کو ہٹا دیا یا ایسے اسباب بتائے جس سے وہ معاملہ خود ہی ہٹ گیا) اور بندہ اس فیصلہ سے راضی نہ ہوا تو یہ اس کے لیے جائز نہیں جس سے توبہ کرنا واجب ہے۔ اللہ سے مشورہ لے کر اس پر افسوس کرنا کہاں کا تقویٰ ہے۔

زبدۃ العارفین ابوالحسن سید علی بن عثمان ہجویریؒ اپنی کتاب کشف المحجوب میں لکھتے ہیں کہ اس تصنیف کو شروع کرنے سے پہلے استخارہ کی طرف اس لیے متوجہ ہوا کہ حقِ تعالیٰ کے حقوق اور ان کے آداب کی حفاظت پر عمل کیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور آپ کے ساتھیوں کے لیے اس کا حکم فرمایا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فاذاقرات القرلن فاستعذ بالله من الشيطان الرجيم۔

ترجمہ: ''اور جب تم قرآن کریم پڑھو تو شیطان مردود کی فریب کاریوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو۔''

استعاذہ، استخارہ اور استعانۃ سب کا ایک ہی مفہوم اور معنی ہیں۔ مطلب یہ کہ اپنے تمام کام اللہ تعالیٰ کے سپرد و حوالہ کر کے ہر قسم کی آفتوں سے محفوظ رہنے کے لیے اس سے مدد حاصل کرو۔ بندہ کے لیے یہی ضروری اور مناسب ہے کہ تمام کاموں میں استخارہ کرے تا کہ اللہ تعالیٰ اس کے کاموں کو ہر زیان، نقصان، خلل اور آفت سے محفوظ رکھے۔

اب مسئلہ یہ کہ استخارہ کس کام کیلئے اور کیسے کرنا ہے؟ جب بھی کوئی جائز کام کرنا ہو یا دو میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو تو استخارہ کرنا بہتر ہے۔ کرنا کیسے ہے؟ اس کے لیے مختلف مشائخ نے طریقہ 'کار بتائے ہیں۔ ان سب میں کچھ باتیں مشترک ہیں مثلاً دعائے استخارہ بھی تقریباً کچھ الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ ایک سی ہے۔ روحانی سکالر سید مزمل حسینؒ اپنی کتاب ''اسلامی وظائف کا انسائیکلو پیڈیا'' میں اس کا طریقہ کچھ اس طرح لکھتے ہیں...... ''بعد نماز عشاء دو رکعت نماز نفل بہ نیت استخارہ ادا کرے اور یہ دعا پڑھا کرے۔'' (جبکہ کچھ کا خیال ہے کہ نفل ضروری نہیں صرف دعا کر لیا کریں۔ مولا علی حیدرِ کرارؓ کے ایک قول کے مطابق کہ میں روزانہ استخارہ کرتا ہوں

تا کہ جس کام میں اللہ کی رضا شامل نہ ہو اس سے بچوں اور استخارہ کے ساتھ نوافل کا ذکر نہیں ہے)

اللھم انی استخیرک بعلمک واستقدرک بقدرتک واسئلک من فضلک العظیم فانک تقدر ولا اقدر وتعلم ولا اعلم وانت علام الغیوب اللھم ان کنت تعلم ان ھذا الامر خیر لی فی دینی ومعاشی وعاقبت امری فاقدرہ لی و یسرہ لی ثم بارک لی فیہ وان کنت تعلم ان ھذا الامر شر لی فی دینی ودنیای وعاقبت امری فا اصرفہ عنی واصرفنی عنہ واقدر لی الخیر حیث کان ثم ارضنی بہ۔

(استخارہ کی دعا ہر نماز کی کتاب میں لکھی ہوتی ہے، چونکہ آسانی سے مل جاتی ہے، اس لیے یہاں اعراب کے ساتھ نہیں لکھی گئی۔)

ترجمہ: ''اے اللہ میں تجھ سے بھلائی مانگتا ہوں تیرے علم کے ساتھ اور قدرت مانگتا ہوں تیری قدرت کے ساتھ اور تیرا بڑا فضل مانگتا ہوں بے شک تو قادر ہے اور میں قادر نہیں ہوں اور تو جانتا ہے اور میں نہیں جانتا ہوں اور تو جاننے والا ہے۔ چھپی ہوئی باتوں کا اے اللہ اگر تو جانتا ہے اس کام کو اچھا میرے لیے دین اور اس کو میرے لیے آسان کر پھر اس میں میرے لیے برکت دے اور اگر تو جانتا ہے اس کام کو برا میرے لیے دین اور میری اور میرے انجام کار میں تو پھیر دے اس کو مجھ سے اور مجھ کو اس سے اور مقدر کر میرے واسطے بھلائی جہاں ہو، پھر مجھ کو اس کے ساتھ راضی کر دے۔''

استخارہ طلبِ خیر ہے، طلبِ خبر نہیں۔ دعائے استخارہ کے الفاظ کو بعینہ ادا کرنا اور جس طرح حدیث میں وارد ہوا ہے، اسی طرح یاد کرنا چاہئے۔ زبان جو بھی ہو، معنی یاد ہوں تو دعا دل سے اضطرار کی کیفیت کے ساتھ ادا ہوگی۔ مشائخ نے مختلف طریقے لکھے ہیں۔ کچھ کا خیال ہے کہ اگر عربی میں نہیں آتی تو اپنی زبان میں دعا کر لیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ نفل ضروری نہیں، صرف دعا ہی کافی ہوتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی انگنت نعمتوں میں سے یہ بھی ایک بڑی نعمت ہے جس سے انسان غافل ہو کر اپنے لیے بہت سے مسائل پیدا کر لیتا ہے۔ اگر اللہ سے مشورہ کرے وہ کبھی بھٹکنے نہیں دے گا۔ جس شق کی طرف دل مطمئن ہو جائے، اس کو اختیار کر کے حقِ تعالیٰ کی تجویز سمجھ کر اسی پر راضی رہنا چاہئے اور یقینِ کامل ہو کہ اسی میں خیر ہے۔ لیکن کچھ لوگوں نے اپنے

دنیاوی مفاد کی خاطر دین میں شرطیں لگا دی ہیں۔ وہ مسلمان جو قرآن وحدیث پر عمل کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ معصوم اور سادہ لوگوں کو یہ بتاتے ہیں کہ ہمارے پاس مؤکل ہیں جن کے ذریعے ہم استخارہ کر کے بتاتے ہیں۔ ایک بھاری رقم وصول کرنے کے ساتھ یہ بھی شرط ہوتی ہے کہ کام آپ کا ایسے ہی ہوگا۔ یہ کون سا استخارہ ہوتا ہے؟ اب تو سوشل میڈیا پر کھلے عام ان کے اشتہار آرہے ہوتے ہیں۔ پھر بھی جہالت کا یہ عالم ہے کہ لوگ ان کے پاس اپنی مرادیں لے کر جاتے ہیں۔ دعا کے الفاظ پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ استخارہ کرنے والا اپنے لیے کر رہا ہے نہ کہ دوسرے کے لیے مشورہ مانگ رہا ہے۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ایسے لوگوں کو کوئی پوچھنے والا نہیں جو نہ صرف پیسہ لوٹتے ہیں بلکہ اسلام میں تبدیلیاں پیدا کرتے ہیں۔ خود گمراہ ہو کر دوسروں کو بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔ استخارہ کی دعا اضطرابِ قلب کو ختم کرنے، اللہ کی رضا پر راضی رہنے اور شکوہ شکایت کی عادت سے نجات دلانے کیلئے مانگی جاتی ہے۔ ہر مسلمان اپنے لیے خود کر سکتا ہے (البتہ کوئی بیمار، بچہ یا ذہنی مریض ہو تو اور بات ہے کیونکہ وہ خود اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ دوسروں کے لیے مسئلہ ہوتے ہیں)۔ حدیثِ پاک پر غور کیا جائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں استخارہ کی تلقین فرماتے ہیں۔ اگر ہم صرف اسی حدیثِ پاک پر عمل کریں تو اس کی فیوض و برکات ہماری زندگی بدل سکتی ہیں۔ ہمیں مذکورہ حدیثِ پاک پر عمل کرنے کا عہد کرنا ہوگا اور اس کی برکات کے بارے میں دوسرے لوگوں کو آگاہ کرنا ہوگا۔ اس سے ہماری دینی اور دنیاوی مشکلات حل ہو جائیں گی۔ فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس شخص کے چہرے کو روشن رکھے گا جس کسی نے میری ایک صحیح حدیث سنی، اس پر عمل کیا اور آگے بتایا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

ترجمہ: ''وہ لوگ جو ایمان لائے اور اللہ کے ذکر سے انہیں اطمینان ہو گیا۔
خوب سن لو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہو ہی جاتا ہے۔''

روحانی وجسمانی امراض کا علاج بھی ذکر اللہ سے ہوتا ہے۔
اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کرنے توفیق عطا فرمائے آمین۔ ثم آمین۔

21 اپریل 2018ء

تحلیلِ صحافت

جب کوئی ہنرمند اپنے کام کا آغاز کرنے لگے تو سب سے پہلے اس مواد کی اچھی طرح چھان بین کرتا ہے جیسے کوئی چیز وجود میں لانا مقصود ہو۔ کیونکہ مواد کا خالص، صاف اور شفاف ہونا فن پارے کے حسن و جمال اور پائیداری کی ضمانت ہے۔ بنانے والا چاہے مٹی کے برتن بنائے، سونے کے زیورات، لوہے کے اوزار یا کوئی تحریر لکھے، یہاں تک کہ کسی انسان کی تربیت کرنا مقصود ہو، اس میں استعمال ہونے والے خام مال سے فالتو چیزوں کو نکالا جائے گا کیونکہ غیر ضروری اشیاء اصل کے لیے نقصان کا باعث بنتی ہیں۔ ارسطو کے دور میں جب کوئی بیمار پڑتا تو اس کو ایسا تریاق پلایا جاتا تھا جس سے مریض کے پیٹ کی صفائی ہو جاتی تھی اور مرض میں افاقہ ہوتا تھا۔ یہ طریقۂ علاج بہت پرانا ہے اور اسی طرح تحلیلِ نفسی کی بنیاد پڑی۔ وہ خیالات و خدشات جو انسان کے لاشعور سے شعور میں آ کر پریشانی کا سبب بنتے ہیں، انہیں کہیں اور منتقل کر دیا جائے تو ہیجانی کیفیت کم ہونے لگتی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہر مفید چیز کے ساتھ غیر مفید کا وجود بھی ہوتا ہے جس کا اخراج ضروری ہے ورنہ وہ اصل مواد کے ساتھ مل کر اس کی ہیئت کو بدل دے گا۔ اب یہ تخلیق کار کی ذمہ داری ہے کہ اپنے فن کے عروج کے لیے ماحول سازگار بنائے تبھی اصل شہکار کا تشخص برقرار رہ سکے گا۔

باقی تمام علوم و ہنر کی طرح صحافت بھی ایک ہنر ہے جو ہر انسان کو نہیں دیا گیا۔ کسی دوسرے کے حالات و جذبات کو اس طرح بیان کرنا جیسے اس کی اپنی ذات پر بیتے ہوں، اپنے قیمتی وقت کے کچھ لمحے دوسروں کو دے کر ان کی سننا، ان کی دادرسی کرنا، ان کی آنکھوں کے آنسو چننا، زخموں پر نرم لہجے سے مرہم رکھنا، کسی کمزور و مجبور کو عزت کا احساس دلانا، بغیر تعلق، رشتے اور لالچ کے ہمدردی کا احساس دلانا ہی انسانیت ہے۔ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر مظلوم کی آواز بننا، خاموشی کے پیچھے چھپی داستانِ غم کو سمجھنا اور مخلوقِ خدا سے محبت کرنا...... اس سے بڑی عبادت کیا ہو

سکتی ہے؟ یہی چیز فرشتوں کے اندر انسان ہونے کی حسرت پیدا کرتی ہے۔

جس طرح باقی ہر شعبہ زندگی میں ملاوٹ ہو چکی ہے، صحافت بھی محفوظ نہیں رہی۔ ان لوگوں نے بھی اپنی گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں پر بھی ''پریس'' لکھوا رکھا ہے جن کا دور دور تک کسی پریس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ ان میں زیادہ تعداد گوالوں کی ہے۔ جب ایک گدھا گاڑی کے پیچھے ''پریس'' لکھا دیکھا تو بڑی حیرت سے اس بھائی سے پوچھا گیا کہ پریس والے آپ ہیں یا گدھا؟ جواباً اس کا خاموش تبسم اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ آپ کی پہلی بات تخمینی اور دوسری یقینی ہے۔ اب اس پر کون نوٹس لے گا؟ ظاہر ہے جن کا یہ شعبہ ہے، انہی کو صفائی کرنا پڑے گی کیونکہ علم و فن بھی اللہ تبارک و تعالیٰ کا ایک تحفہ ہے۔ جس پر یہ کرامت فرمائے، اس کو چاہئے کہ اس انمول تحفے کی قدر اور حفاظت کرے۔ اپنے جیسے لوگوں کے ساتھ میل جول رکھے۔ اگر آپ کے پاس علم زیادہ ہے تو دوسرے اس سے فائدہ حاصل کریں اور اگر کم ہے تو آپ دوسروں سے استفادہ کریں۔ انسان جس بھی شعبہء زندگی میں ہو، اکیلا نہیں ہوتا بلکہ اس جیسے کئی لوگ موجود ہوتے ہیں۔ ان کا آپس میں تعلق ایک برادری کی مانند ہوتا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک برائی کا مرتکب ہوتا ہے تو یہ بات سب کے لیے باعثِ شرم ہوتی ہے اور اگر کوئی نیک نامی کمائے تب بھی اس سے متعلقہ سب لوگوں کا سر فخر سے بلند ہوتا ہے۔ جب اتحاد کی سوچ ختم ہو جائے، ہر فرد انفرادیت کے فائدے نقصان کا سوچنے لگے تو خود غرضی کی بے رحم لہریں ساحلِ سمندر کی ریت کی طرح سب کو بکھیر کر اپنے ساتھ بہا لے جانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ اتحاد کا ٹوٹنا کسی آفت سے کم نہیں ہوتا کیونکہ یہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان مایوسی کی زد میں آتا ہے۔ اسے چاہیے کہ صبر کے ساتھ انتظار کرے اور نم آنکھوں سے رب کی رحمت کا منتظر رہے۔ ایسے لوگوں کیلئے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ولسوف یعطیک ربک فترضی۔ (سورۃ الضحیٰ۔ آیت: 5)

ترجمہ: ''اور جلد ہی آپکا رب آپ کو اتنا دے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔''

اللہ کے ایک بندے نے ادیب کی تعریف کچھ اس طرح کی ہے کہ جس میں نیک خصلتیں زیادہ ہوں، وہ ادیب ہوتا ہے۔ یعنی ادب کی حقیقت خصائلِ جمیلہ کا جمع کرنا ہے۔ اس میں ادب سے تعلق رکھنے والے سب آ جاتے ہیں۔ جب انسان نیک نیتی کے ساتھ اپنا کام سرانجام دیتا ہے

تو وہ جسمانی عبادات سے زیادہ اجر و ثواب کا کام ہوتا ہے اور یہی اصول ادب پر لاگو ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ صحافت بھی عبادت ہے تو سننے والے کے تمام اعصاب پر جیسے بجلی گر پڑے۔ وہ نہیں جانتے کہ جو دس جانوروں کا ذکر قرآنِ پاک میں آیا ہے، ان میں سے ایک ہدہد بھی ہے۔ وہ کس عمل کی وجہ سے پرندہ ہو کر کہتا ہے کہ میری بات سن کر اللہ کے نبیؑ مجھے سزا نہیں دیں گے؟ کیونکہ وہ سچی خبر لایا تھا۔ اگر انہوں نے قرآنِ پاک میں سورۃ النمل میں ملکہ سبا کا قصہ پڑھا ہوتا تو انہیں پتہ چلتا کہ حضرت سلیمانؑ کے لشکر سے جب ہدہد غیر حاضر پایا گیا تو حضرت سلیمانؑ کو غصہ آ گیا اور فرمایا کہ میں اسے سخت عذاب دوں گا اگر وہ کوئی غیر حاضری کی واضح وجہ پیش نہ کر سکا تو۔ پھر پرندوں کے نگران گدھ کو اور سردار عقاب کو بھیجا کہ اسے تلاش کر کے لاؤ۔ جب سزا کی خبر ہدہد کو ملی تو ساتھ شرط سن کر اسے اطمینان ہو گیا کہ میں ایسی سچی خبر لایا ہوں جسے سن کر اللہ کے نبیؑ مجھے معاف فرما دیں گے۔ ہدہد کو جب حضرت سلیمانؑ کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے کہا۔

ترجمہ: ''تو بہت دیر نہیں گزری کہ ہدہد آ گیا اور کہنے لگا کہ میں نے وہ بات معلوم کی ہے جو تجھ کو (بھی) معلوم نہیں ہے اور میں (شہر) سبا سے ایک تحقیق (یقینی) خبر لے کر آیا ہوں۔'' (سورۃ النمل۔ آیت 22)

اس واقعہ سے یہ بات واضح ہو گئی ان لوگوں کے لیے جن کا عقیدہ ہے کہ اللہ کے نیک بندوں کو سب کچھ نظر آتا ہے جبکہ علمِ غائب صرف اللہ کی ذات ہی جانتی ہے۔ اس نے اپنے نبیوںؑ کو بس اتنا علم دیا، جتنا ان کی ضرورت ہوتی تھی۔ ہر اہلِ علم و ہنر اور اہلِ معاملہ کے لیے اپنے اسرار کے اظہار و بیان میں خاص اشارات و کلمات ہوتے ہیں اور ان اشاروں کو دوسرے نہیں سمجھ سکتے۔ دورِ حاضر کی معلومات اور حالات سے باخبر رکھنے والی صحافت ہے۔ پچھلے دنوں میں نے ایک بہن کا آرٹیکل پڑھا جس میں لکھا تھا کہ صحافی کی زندگی سگریٹ، سگار، چائے اور خبر ہے۔ یہ ریمارکس ان لوگوں کے لیے ہیں جو قلم سے جہاد کا فن جانتے ہیں۔

اب یہ ہر صحافی کی ذمہ داری ہے کہ صحافت کے نام کا غلط استعمال کرنے والوں کی پہچان کرے۔ جن لوگوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں، ان کے لائسنس واپس لیے جائیں۔ گاڑیوں سے پریس کی نمبر پلیٹیں اُتروائی جائیں اور صحافت کے نام پر دوسروں کو بلیک میل کرنے والوں کو سخت سزائیں دلائی جائیں تاکہ سزا پانے والوں کو دیکھ کر دوسروں کو پتہ چلے کہ تبدیلی آ نہیں رہی، تبدیلی

آ چکی ہے۔ صحافت کو تحلیل کر کے نئے سرے سے شروع کرنے کی ضرورت ہے۔ اب اپنے مسائل ہم نے خود حل کرنے ہیں۔

کیا اس کے لیے بھی چیف جسٹس ہی نوٹس لیں؟

کیا ہم میں اتنی ہمت بھی نہیں کہ اپنے حق کے لیے خود آواز اٹھائیں؟

اپنے آس پاس کی برائیوں کو کب تک نظر انداز کرتے رہے گے؟ جھوٹی اور من گھڑت خبریں پھیلانے والوں کا مقابلہ کریں۔ شاید اس کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی یا ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ کسی کو پہل کرنا پڑے گی، ہمت کرنا پڑے گی......لو ابتدا ہم نے کر دی......اس جرم بغاوت کی رسم نبھانے سب سے پہلے ہم نکلے ہیں......

اللہ تعالیٰ ہم سب کی مدد فرمائے۔ آمین۔

24 اپریل 2018ء

بدعنوانی یا کرپشن

دودھ والے نے برتن باباجی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے مکاری سے مہنگائی کا رونا روتے ہوئے کرپشن کا ذکر بھی کرڈالا۔ باباجی نے ایک نظر دودھ پر ڈالی جس میں پانی ملانے کی بجائے پانی میں دودھ کی ملاوٹ کا گماں تھا پھر جب اس کے چہرے کو بغور دیکھا تو اس پر کہیں ندامت کے آثار نہ تھے۔ آنکھوں کا جائزہ لینے کے بعد یقین ہو گیا کہ جس چیز کی تلاش مجھے ہے، وہ کہیں نہیں۔ اس کا مسکن یہاں سے میلوں دور ہے۔ ہماری روزمرہ زندگی میں کچھ الفاظ ایسے ہیں جو زبان زدِ عام ہوتے ہیں لیکن ان کا مطلب بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ ان الفاظ کے استعمال کا رواج عام ہے۔ جیسے آج کل کرپشن اور بدعنوانی کا ہے۔ اسے حکمرانوں کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ہے یعنی وہ چوری، ہیرا پھری، سرکاری ٹھیکوں میں بھاری کمیشن اور بدعنوانی جو سرکاری اہلکار اور حکومتی سیاسی اراکین کرتے ہیں۔ اپنے اردگرد جائزہ لیں کہ کون سا سرکاری ادارہ ہے جو بدعنوانی میں ملوث نہیں؟ کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جن کو برا ہی نہیں سمجھا جاتا۔ مثال کے طور پر امتحان میں نقل کرنا جرم تو سمجھا جاتا ہے مگر گناہ نہیں حالانکہ اس میں بھی دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ علم والے اور بغیر علم کے برابر نہیں ہو سکتے لیکن یہاں معاملہ ہی الٹ ہے۔ بغیر محنت کیے رشوت دے کر کوئی زیادہ نمبروں کی وجہ سے مصنوعی پوزیشن حاصل کرے تو کیا یہ بدعنوانی نہیں؟ وقتی طور پر ایسا کرنے والے طلباء و طالبات کو محض علامتی سزا دی جاتی ہے لیکن انہیں اس کے مضمرات، نقصانات، اخلاقی تقاضے اور گناہ و ثواب کے بارے میں بتایا ہی نہیں جاتا۔ اگر انہیں اسلامی و دینی نقطۂ نظر سے بتایا جائے تو یقینی طور پر طلبہ موقع میسر ہونے کے باوجود اس فعل کو ترک کر دیں گے۔

کوئی بھی شجر زیرِ زمین پل کر باہر نہیں آتا بلکہ بیج سے ایک نحیف و نزار سا پودا نکلتا ہے۔ اگر

اسے تلف کرنا مقصود ہو تو جڑیں توانا ہونے سے قبل خاتمہ آسان ہے۔ اسی طرح برائی کا ادراک اخلاقیات سے ہونا چاہیئے۔ خود غرضی سے شروع ہونے والا سلسلہ درجہ بدرجہ ترقی پا کر طوفانِ بدتمیزی کی حدود کو پار کرتا ہوا بے شرمی کی دہلیز تک جا پہنچتا ہے۔ پھر معاشرے میں پائی جانے والی خرابیوں کی آمیزش کا مرحلہ آتا ہے اور یہ مکسچر اضطراب کا سبب بن کر مختلف اقسام کے منفی فارمولے ایجاد کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ ایجادات چونکہ وسعتِ عقلی کی علامت ہوتی ہیں، اس لیے ایسے لوگوں کو آج کے دور میں ہوشیار کہا جاتا ہے جنہوں نے کوئی نئی چیز ایجاد کی، چاہے وہ چائے کی پتی میں چنے کے چھلکے ملانے کی ہو، دودھ کا کھویا بناتے ہوئے چاول کا پاؤڈر ملانے کی ہو، انسانوں کے دلوں میں دراڑیں پیدا کر کے اپنی فرعونیت کو برقرار رکھنے کی ہو، دوسروں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر ان کو بے وقوف کا لقب دینے کی ہو، پکوڑوں میں گلی ہوئی سبزیاں ڈالنے کی ہو یا مذہب میں خود ساختہ کہانیاں تراشنے کی ہو۔ اب یہ تعین ہمیں خود کرنا ہے کہ ان کے دلِ مضطرب کا یہی کام ہے، پھر نہ ان کو چین ہے نہ آرام، کیا ان کے پیچھے جانا ہے یا اپنے لیے صحیح راستے کا انتخاب کرنا ہے؟ یہ سچ ہے کہ ایسے لوگوں کے دماغ زنگ آلود تو نہیں، پر ان کی حاضر دماغی پر داد دینے سے ان کے حوصلے بلند ہو کر سینہ چوڑا ہو جاتا ہے۔ کسی غلط کام کو ہم اگر ہاتھ سے نہیں روک سکتے تو اس کو کم از کم زبان سے برا کہنا چاہیئے۔ اس کی بھی ہمت نہیں تو دل میں تسلیم کرنا چاہیئے۔ اپنی آنکھوں سے دوسروں کی بربادی دیکھ کر یہ کہنا کہ یہ میرا مسئلہ نہیں، مسائل کا حل نہیں۔ جب ہم مشکل میں ہوں گے تو کون مدد کو آئے گا؟ کبھی دوسروں کی جگہ پر خود کو رکھ کر دیکھنا۔

مرے درد کی سن کے جو داستاں وہ ترا مسکرانا
تری آنکھ ہو نم میں بھی مسکراؤں تو کیسا لگے گا

ملازمت وقت کی اہم ضرورت بلکہ اب شرطِ زندگی سمجھی جاتی ہے۔ جس کے پاس سفارش نہیں اسے خواب دیکھنے کی ضرورت نہیں اور اگر کسی صاحبِ حیثیت کے پاس اس مقصد کے لیے جائے تو خالی ہاتھ جانے کا مطلب ہے خالی ہاتھ لوٹنا، اس لیے اپنی اوقات کے مطابق نہیں، بلکہ اپنی ڈگری اور نوکری کے مطابق تحفے تحائف ساتھ لے کر جانا پڑیں گے اور جب کوئی مذہبی مسئلہ سامنے آ جائے، یہ رسم وہاں بھی نبھانا پڑے گی۔ اس کے بعد کوئی درمیانی راستہ ڈھونڈا جاتا ہے۔ اگر قرآن وحدیث کا حوالہ نہ مل سکے تو کسی اور کتاب سے رہنمائی لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسے

آپ ضمیر فروشی کہیں گے یا دین فروشی؟ یا پھر بدعنوانی یعنی کرپشن؟ جب استاد کلاس روم میں نیٹ پر چیٹ اور کال میں مصروف ہو اور بچے اس کے سامنے کتابیں کھول کر لکھنے میں مصروف ہوں، کیا یہ کرپشن نہیں؟ جب وکیل اپنی فیس کی خاطر سچ پر نہ صرف پردہ ڈال دے بلکہ سچ چھپانے کے لیے کئی جھوٹ بول کر اپنے ضمیر اور مدِ مقابل کو مطمئن کرنے کی کوشش کرے، کیا یہ بدعنوانی نہیں ہے؟

یہ وہ مقدمات ہیں جن کی جرح ہمارا ذہن کرتا ہے۔ ہم خود ہی وکیل بن جاتے ہیں جبکہ منصف ہمارا ضمیر ہوتا ہے اور اگر منصف سو چکا ہو تو انجام کیا ہوگا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک دیانتدار شخص کا واسطہ ایسے انسان سے پڑتا ہے جس کا سامنا ممکن نہ ہو اور اس کی ناراضی بھی مول نہ لے سکے تو اس کے غلط نظریات و احکامات کو مجبوری کا نام دے کر تسلیم کر لیتا ہے۔ وہ کبھی اندر سے نیک تھا ہی نہیں۔ ناسور اس کے اندر موجود تھا، اس کو باہر آنے کا موقع اب ملا کیونکہ خوفِ خدا رکھنے والوں میں کبھی ایسی تبدیلی آ ہی نہیں سکتی۔ وہ جانتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ''پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔'' پورا داخل ہونے کا مطلب یہی ہے کہ حالات کیسے بھی ہوں، مجبوری جو بھی ہو، کوئی فیصلہ اسلام کے خلاف مت کرنا اور جو حق کی خاطر مرنا نہیں جانتا، حق پر زندہ رہنا کیا جانے؟ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ''اور پورا کرو وعدہ اللہ تعالیٰ کا جب عہد باندھو تم اور قسموں کو پکا کرنے کے بعد ان کو نہ توڑو جس حال میں تم اللہ تعالیٰ کو اپنا ضامن کر چکے ہو بے شک اللہ تعالیٰ جو تم کرتے ہو وہ جانتا ہے (اگر تم قسم یا عہد کو توڑو گے تو وہ تم کو سزا دے گا)۔'' (سورۃ النحل۔ آیت: 91)

جبکہ ہمارا وطیرہ ہے کہ ''وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا''...... اللہ کریم فضل بھی کرتا ہے اور کرم بھی، معجزے دکھاتا ہے لیکن تقویٰ کرنے والوں کو۔

سورۃ العمران آیت: 74 میں اسی طرح ارشاد فرمایا گیا:

''جس کو چاہتا ہے اپنی مہربانی کے لیے خاص کرتا ہے۔''

اپنی دعاؤں سے پہلے اپنے عمل بھی دیکھنے چاہئیں۔ جو اللہ کو اپنا آپ دے دیتا ہے، اللہ اس کا ہو جاتا ہے۔ جتنی محنت سے ملاوت کرتے ہیں، اگر اتنا ہی ٹائم اپنے رب کو دے دیں تو وہ ہماری

مشکلات کو آسان کر دے گا۔ کوئی کام اچھا کرنا بھی ہے تو ریا کاری کے لیے اور ریا کار کو صلہ اسی جہان میں ملتا ہے پھر سکون کہاں سے آئے۔

ایک شخص نے شیخ سعدیؒ سے کہا کہ میں سکون چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا بڑا آسان کام ہے۔ تم اپنے جملے سے سکون حاصل کر سکتے ہو، بس اس میں سے پہلے ''میں'' اور پھر ''چاہتا ہوں'' نکال دو، باقی سکون ہی سکون ہے۔ ''میں'' انسان کو کبھی اللہ کے قریب نہیں جانے دیتی اور اللہ سے دور رہ کر کبھی سکون نہیں ملتا۔ جب اللہ کا قرب ملتا ہے، اکڑ خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ مومن کا دل ہر وقت حالتِ اضطراب میں رہتا ہے جو خالق اور مخلوق کے درمیان تعلق قائم کرنے میں بے نیازی سے مصروف رہتا ہے، اس کے عوض اسے کیا ملتا ہے محبت میں یہ سوال ہی نہیں۔ میری تحریر کی زد میں ابھی تو کچھ بھی نہیں آسکا۔

بدعنوانی سے چھٹکارا تب ہی ممکن ہے اگر ہم حرام اور حلال، اچھائی اور برائی، خوبی اور خامی، لالچ، طمع، جھوٹ، سچ، چوری، ڈکیتی اور حقدار کی حق تلفی جیسے لغت کے الفاظ کے معانی بہت اچھی طرح سے جان جائیں۔

8 مئی 2018ء

ماہِ رمضان میں مہنگائی

باورچی خانے میں نظر پڑتے ہی ایسے لگا کہ کسی فروٹ منڈی میں ہوں۔ ہر طرف پھلوں کے تھیلے پڑے دکھائی دیے اور طرح طرح کے کھانوں کی ڈشز سے پوری سلف سجی ہوئی تھی۔ یہاں کسی کی دعوت نہیں تھی بلکہ یہ اہتمام پورا مہینہ چلے گا۔ پھلوں اور کھانوں کا یہ میلہ ماہِ رمضان میں نہ صرف ہر روزے دار کے گھر میں لگتا ہے بلکہ بعض بے روزے دار خاندانوں میں بھی اس سنت کا بڑے تپاک کے ساتھ اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہ اور بات کہ وہ فرض بھول جاتے ہیں۔ پورا سال ہم کیا کھاتے ہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فرق صرف اس بات سے ہے کہ رمضان چونکہ نعمتوں کا مہینہ ہے، دنیا جہان کے پھل اور کھانوں کو ہی نعمتیں سمجھا جاتا ہے، اس میں لوگ اپنی حیثیت اور مقصد کو بھول کر کھاتے ہیں اور جنہیں یہ سب میسر نہ آسکے، وہ غصے کا اظہار روزے سے دستبردار ہو کر کرتے ہیں۔ یہ سب ضرورت کے تحت نہیں بلکہ ہمارے ہاں رواج پا گیا ہے ورنہ روزے دار کو پہلے سے ہلکی خوراک لینی چاہئے تاکہ مقاصدِ روزہ فوت نہ ہوں۔ یہ باطنی عبادت ہے جس کا ظاہر سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا علم اللہ اور بندے کے سوا کسی کو نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اس کی جزا بے حساب ہے، اجر بھی زیادہ ہے کہ یہ آدھی طریقت ہے۔ معدے کے ساتھ زبان، سمع و بصر کا روزہ۔ اس حالت میں کوئی کیسے گناہ کرسکتا ہے یعنی روزے کا حقیقی مطلب گناہ سے رکنا ہے۔ معدے کو خالی رکھنا ادنیٰ درجہ ہے لیکن اس کو شریعت اور عقل دونوں پسند کرتے ہیں۔ ان شرائط کے تحت اگر روزہ نہ رکھا جائے تو بھوکا پیاسا رہ کر ہم اصل فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

حواس کو اپنے کنٹرول میں رکھنا چاہئے کیونکہ ان کی وجہ سے برائی شروع ہوتی ہے اور برائی حد سے بڑھ جانے پر گناہ بن جاتی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ حواس ہمارے اعمال کے سپہ سالار ہیں۔ اگر یہ اپنے دروازے بند کرلیں تو انسان کا باطن ایک مضبوط قلعہ بن جاتا ہے جس میں داخل ہونا فرسودہ خیالات اور شیاطین کے لیے کسی کھلے چیلنج سے کم نہیں ہوتا۔ روزے کا حقیقی مقصد نفسانی

خواہشات اور دنیاوی کھیل کود سے بچنا ہے کیونکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''**وما جعلنا ھم جسد الا یاکلون الطعام**'' ۔ کیا ہم نے پیغمبروں کے جسموں کو ایسے نہیں بنایا کہ وہ کھانا نہ کھائیں، عام انسان سے لے کر نبیوں تک سب کو کھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے رکنا حرام چیزوں سے چاہئے۔ خالی حلال چیزوں سے رکنے کا مطلب روزہ نہیں، رمضان رحمتوں اور نعمتوں کا مہینہ ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانے والے اپنی سوچ کے مطابق مطلب نکالتے ہیں۔ کچھ لوگ سحری و افطاری کے وقت پیٹ بھر کر کھانے کو نعمت سمجھتے ہیں۔ ابھی رمضان شروع نہیں ہوتا کہ مارکیٹوں اور بازاروں میں مہنگائی سر چڑھ کر بولتی ہے۔ تاجر چاہے فروٹ کا ہو، سبزی کا، گوشت کا، اشیائے خورد و نوش کا، کپڑے کا یا جوتے کا، یہاں تک کہ بازار میں بیٹھا ہر شخص چیزوں کی قیمت دگنی کر کے مال بناتا ہے۔ نہ صرف اپنے بلکہ پورے خاندان کے عمرہ مبارک کے اور کچھ قربانی کے پیسے اسی مہینہ میں پورے کر لیتے ہیں۔ اسی کو رمضان کی برکت سمجھا جاتا ہے۔ تمام میڈیا مہنگائی کا رونا رو کر مختلف شو اور خبروں سے اپنے ذرائع کو چار چاند لگاتے ہیں۔

حکمران ''رمضان بازار''، ''سستا بازار'' اور مختلف ناموں سے سٹالز لگوا کر شہرت حاصل کرتے ہیں۔ عوام مہنگائی پر حکومت اور تاجروں کو گالیاں دے کر ہر جگہ ہر وقت اس کے ذکر و اذکار کو ہی وظائف سمجھ کر کرتے ہیں۔ ان شکوہ و شکایات سے کیا فرق پڑتا ہے؟ حالانکہ مہنگائی کے بخار سے نجات حاصل کرنے کا نسخہ صرف عوام کے پاس ہے۔ اگر چاہیں تو ایسی موذی امراض کی گردن توڑ سکتے ہیں کیونکہ حکومتی مشینری اس میں بری طرح ناکام ہو چکی ہے۔ وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ اس طوفان کا رخ موڑنا ان کے بس میں نہیں۔ یہ فردِ واحد کی نہیں بلکہ ہم سب کی جنگ ہے جس کو ہم نے جیتنا ہے۔ اس مبارک مہینے کو اللہ کی مرضی کے مطابق گزارنے کا عہد کرتے ہوئے سنتِ نبوی پر عمل کر کے سادگی سے سحری و افطاری کا اہتمام کیا جائے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نمک، کھجور اور پانی کے ساتھ افطار کر لیا کرتے۔ روزہ کو اللہ کی عبادت سمجھ کر رکھنا چاہئے نہ کہ احسان جتاتے ہوئے۔

جب کسی بے روزگار سے پوچھا جائے کہ روزے کی سعادت سے محروم کیوں رہتے ہو؟ جواب کیا آتا ہے؟ غربت کی وجہ سے۔ یہ کیسی غربت ہے جو اللہ کے فرض سے روکتی ہے۔ باقی گیارہ ماہ گزر جاتے ہیں، اگر اس مہینے میں پھل نہ ملے تو قیامت نہیں آجاتی۔ سموسے، پکوڑے،

فروٹ چاٹ اور دودھ سوڈا میسر نہ ہو تو افطاری نہیں ہوتی۔ یہ لوازمات کب لازم ہوئے روزے کے ساتھ؟ پورے سال کی جمع پونجی رمضان میں کھا جاتے ہیں اور ساتھ ہائے مہنگائی کا ورد جاری رکھا جاتا ہے۔ جس چیز کا تین دن بائیکاٹ کیا جائے، اس کی قیمت گر جاتی ہے لیکن یہ تین دن صبر کون کرے؟ میڈیا کو چاہئے کہ اس طرح کی معلومات لوگوں کو دے کر اس سیلاب کے سامنے بند باندھ سکتے ہیں۔ یہ تزکیۂ نفس کا مہینہ ہے۔ ٹی وی شو دیکھنے، افطار پارٹیاں کرنے یا مہنگے کھانوں سے لطف اندوز ہونے کا نہیں۔ عوام کو چاہئے کہ ہر بندہ خود کو بدلنے کی کوشش کرے اور فضول خریداری ترک کر دے۔ رمضان مسلمانوں کا مہینہ ہے اور عید کی رسمیں ہندوانہ، اگر ایک سال عید سادگی سے اسلامی طریقے سے منائی جائے تو دھوکے باز تاجر خود بخود راہِ راست پر آجائیں گے۔ اس طرح مسلمانوں کے معدے اور جیب دونوں کو بوجھ سے بچایا جا سکتا ہے۔ جیبوں کو کترنے والے سب چوہے واپس اپنی بلوں میں چلے جائیں گے۔

اس مہینہ کا نام توریت میں حط، یعنی ''گناہوں کو کھا جانے والا'' اور انجیل میں طاب، اس لیے کہا کیونکہ روزہ دار اس مہینہ میں پاک ہو جاتا ہے، قرآن مجید میں رمضان جو کہ ''رمض'' سے نکلا ہے اور رمض اس بارش کو کہتے ہیں جو خریف سے پہلے ہو، اس ماہ کے پہلے عشرے میں رحمتیں برستی ہیں، دوسرا عشرہ مغفرت کا اور تیسرا جہنم سے نجات کا۔ یہ وہ بابرکت مہینہ ہے جس میں شیاطین بند کر دیے جاتے ہیں اور فرشتے روزے دار کے لیے بخشش کی دعائیں کرتے ہیں۔ شبِ قدر کی رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اسے آخری عشرے کی پانچ طاق راتوں میں ہی تلاش کیا جاتا ہے۔ اس رات کو حضرت جبرائیلؑ کے ساتھ سدرۃ المنتہیٰ کے رہنے والے ستر ہزار فرشتے ان کے ساتھ اترتے ہیں جو نور کے جھنڈے چار مقامات پر گاڑتے ہیں۔ حرمِ کعبہ کے نزدیک، روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک، بیت المقدس اور طورِ سینا کی مسجد کے نزدیک، پھر جبرائیلؑ فرشتوں کو کہتے ہیں کہ اللہ کا حکم ہے کہ زمین پر پھیل جاؤ اور کوئی شہر ملک گاؤں ایسا نہیں رہ جاتا جہاں کوئی روزے دار اور عبادت گزار ہو اور فرشتے نہ پہنچیں۔ یہ سلسلہ طلوعِ فجر تک رہتا ہے۔

ہم ان نعمتوں کو بھول کر صرف دنیاوی چیزوں کو یاد رکھتے ہیں۔ دستر خوان کے میلے جیسی وبائی امراض کا سدِ باب ممکن ہو سکتا ہے۔ اگر ہم اپنی روح کو سیراب کرنے کی کوشش کریں اور اسی کو اصل نعمت سمجھ کر لطائفِ روح حاصل کریں۔

ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

''بطن جائع احب الی اللہ تعالیٰ من سبعین عابد عافل''

اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھوکے کا شکم ستر عاقل عابدوں سے زیادہ محبوب ہے۔ بھوکا رہنا تمام امتوں کی عبادت رہی ہے اور تمام مذاہب اس کو پسند کرتے ہیں۔ ہم نے اس کے ساتھ لوازمات کو شرائط بنالیا ہے۔ اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے ہم روزے کے اصل مقاصد حاصل کر سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

22 مئی 2018ء

راستے کا پتھر ٹھوکر نصیب میں!

تیز رفتار گاڑی جیسے ہی سپیڈ بریکر سے گزری تمام مسافر اپنی نشست سے اچھل کر اس حالت میں آ گئے جیسے سامنے والے سے سرگوشی کے لیے جھکے ہوں۔ ان کو پہلے سے ہی جھکا دیکھ کر واپس اپنے مقام پر آ بیٹھے۔ ڈرائیور کی ذرا سی غفلت کا کفارہ سب مسافروں کو ادا کرنا پڑا۔ ایک جھٹکے نے سب کے جسم و جاں کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ بریکر پھلانگنے کے لیے نہیں تھا۔ رفتار اس سے پہلے کم کرنا تھی کہ آگے بڑا خطرہ ہے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں عقلمند کے لیے اشارہ ہی کافی ہے۔ بالکل اسی طرح زندگی کے سفر میں نشیب و فراز آتے ہیں۔ وہ ہماری رفتار کو حد میں رکھنے کے لیے ہوتے ہیں۔ کئی اقسام کی رکاوٹیں، سپیڈ بریکر، یہ سب ہمارے فائدے کے لیے ہیں لیکن ہماری روش کچھ اس طرح کی ہو چکی ہے کہ ہم اس طرف متوجہ نہیں ہوتے کہ ایسے موڑ کیوں آتے ہیں؟ ان میں کیا راز پوشیدہ ہے؟ اگر تھوڑی توجہ دیں تو معلوم ہوگا کہ نفس کے اعتبار سے انسان تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کا اپنے نفس پر پورا قابو ہوتا ہے، دوسرے وہ جن کو نفس نے قابو کیا ہوتا ہے، تیسرا درجہ ان لوگوں کا ہے جو کبھی نفس کے قابو میں اور کبھی نفس ان کے قابو میں، دونوں کے درمیان کانٹے دار مقابلہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کشمکش میں جیت اس کی ہے جس طرف انسانی ذہن کا جھکاؤ ہوتا ہے۔

اوّل الذکر ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے دل مخلوقِ خدا کی محبت سے لبریز ہوتے ہیں اور وہ زمین پر قدم بھی آہستگی سے رکھتے ہیں تاکہ کسی مخلوق کو ان کی ذات سے انجانے میں بھی ضرر نہ پہنچے۔ پھر بھی ان سے کوئی غیر ارادی خطا ہونے لگے تو اللہ تعالیٰ غیب سے مدد فرما کر اس فعل سے روک کر ان کے ایمان کی حفاظت فرماتا ہے کہ رحمن کے بندوں کو صراطِ مستقیم سے بھٹکنے سے بچایا جا سکے اور وہ متقی بن جائیں۔ سعی و خطا۔ کے باوجود اگر ناکامی کا سامنا کرنا پڑے تو پھر اس کو رب کی رضا سمجھ کر کرب سے بچ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس ہدایت سے دور

رہنے والے ان کو جادو ٹونہ سمجھ کر اپنا ایمان اور دوسروں پر شک کر کے ان پر بہتان لگا کر نہ جانے کتنے گھروں کا سکون برباد کرتے ہیں۔ اپنی ذات کی وادی میں اتر کر اگر دیکھا جائے تو یہ ہمارے ان اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے جنہیں ہم نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مثلاً کسی بے بس مظلوم کے ساتھ انصاف نہ کرنا والدین، اساتذہ، بزرگ و بیمار کا لحاظ نہ کرنا، کمزوروں پر ظلم کر کے ہریالی سے زرد پتوں کی طرح نکال باہر پھینکنا، اپنے ان افعال کی وجہ سے وہ خود بھی دلِ بیکراں کی بستی بن جاتے ہیں۔ پھر بھی اپنے اعمال کی طرف توجہ دینے کی توفیق نہیں ملتی۔ اخلاقیات سے خالی یہ لوگ مٹی پر چلتے پھرتے مٹی کے پتلے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم اپنی زندگی میں آنے والی ہر رکاوٹ کو کسی ایک انسان کے ساتھ منسلک کر دیتے ہیں کہ یہ وہ ہستی ہے جو ہماری ہر کامیابی کے سامنے ایک مضبوط چٹان ہے۔ اسے عبور کرنا ہمارے بس میں نہیں ہوتا جیسے ہی کوئی امید کی کرن نظر آتی ہے اس شخصیت کا خیال ذہن کی دہلیز پر دستک دے کر رات کی سیاہی کی طرح پھیل جاتا ہے۔ خوشی کی لہروں کو مجبوراً رخصتی کا ساماں کرنا پڑتا ہے، تقدیر کی اس تحریر کو پڑھنا ہر کسی کو نہیں آتا۔ یہ سچ ہے کہ کچھ لوگوں کا کام ہی یہی ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کی خوشیوں کو روندنا اور سب کو اپنے جیسا دیکھنا چاہتے ہیں مگر ایسا کر نہیں پاتے کیونکہ جب مدِ مقابل اپنے ہر معاملے کو اللہ کے سپرد کر دیتا ہے تو وہ دلوں کو سکون بخشتا ہے۔ رکاوٹ ڈالنے کی نیت جو بھی ہو، جس کی ہو، ہمیں اپنے مالک پر بھروسہ کرنا چاہئے کہ جس کے حکم کے بغیر ایک ذرہ بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتا۔ شاعر نے اس کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

کبھی کبھار ہم اپنے تصورات میں خلیق کردہ فلک بوس عمارت کی چوٹی پر پہنچ جاتے ہیں کہ پھر اچانک پاؤں پھسلنے سے اپنا توازن کھو بیٹھتے ہیں۔ اس وقت یقینِ کامل ہوتا ہے کہ اب بچنا محال ہے۔ اسی طرح راہ چلتے اچانک راستے میں پڑے پتھر سے ٹکرا جاتے ہیں جسے ہم نے ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا اور اپنی تمام ترناکامیوں کا ذمہ دار بھی ٹھہرایا ہوتا ہے۔ اسی تذبذب میں اس کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ رکاوٹ تھی یا سپیڈ بریکر؟ اس وقت ہمیں اپنی ناقص العقلی پر ندامت کا احساس ہوتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو بہت بڑی چیز تو سمجھتا ہے لیکن اللہ کی حکمت نہیں

سمجھ پاتے کہ جسے ہم اپنی خوشی تصور کرتے ہوں دراصل وہ گہری کھائی ہے جس میں گرنے سے اللہ نے ہمیں بچا لیا۔ جب اس نے کہہ دیا کہ اے انسان تیرا سب سے اچھا دوست میں ہوں، پھر انسان کدھر بھٹکتا پھرتا ہے؟ اللہ اپنے پیاروں کو ہی آزمائش میں ڈالتا ہے۔ انہیں تکلیف میں ہی آزماتا ہے۔ پھر یہی انسان بندگی کی طرف لوٹتے ہیں جیسے سونا آگ میں کندن بنتا ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ آزمانے والی کامل ذات صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے جو ہر لحاظ سے صحیح اور مکمل ہے۔ وہ قرآنِ پاک میں اپنے پیاروں کا ذکر کچھ اس طرح فرماتے ہیں۔

ترجمہ۔ ''(اے پیغمبر) ہم تجھ سے پہلے کتنی امتوں کے پاس (پیغمبر) بھیج چکے ہیں پس پھر ہم نے ان کو سختی اور تکلیف میں گرفتار کیا اس لیے کہ وہ عاجزی کریں۔'' (سورۃ الانعام۔ آیت:42)

اس آیت میں اشارتاً بتایا گیا ہے کہ خود کو پرکھنے کا یہ بھی ایک پیمانہ ہے کہ مشکل وقت میں ہم اللہ کے قریب جاتے ہیں یا دور۔ جنہوں نے مشقتیں جھیلیں وہ اس کے برگزیدہ بندے ٹھہرے۔ سورۃ العصر میں فرمایا: ''بے شک انسان خسارے میں ہے۔'' وہ ہمیشہ اپنی جلد بازی سے نقصان اور تکلیف اٹھاتا ہے۔ خود کو عقلِ کل سمجھنے والا جانتا ہی نہیں کہ اس کی عقل کتنی محدود ہے۔ وہ اپنی خام خیالی میں مگن ہے۔ اگر وہ اس بات پر یقین پختہ کر لے کہ اس کے کام میں رکاوٹ اللہ کی طرف سے آتی ہے، یہ کوئی جادو، ٹونہ یا بندش نہیں بلکہ سپیڈ بریکر ہے جس کا مطلب ہے کہ اپنی رفتار کم کرو اور تیزی مت دکھاؤ یا بہتر رستے کا انتخاب کرو، اسی میں انسان کی بھلائی ہے جو صرف دانا لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اللہ پر بھروسہ، یقین کامل اور پھر اس کی مخلوق کی دعائیں یقینی طور پر اللہ کے بندوں کو منزلِ مقصود تک پہنچانے میں مدد دیتی ہیں۔

28 مئی 2018ء

زکوٰۃ

سیڑھیوں میں پڑا کپڑوں کا تھیلا دیکھ کر میں نے کام کرنے والی ماسی سے اس کے متعلق پوچھا تو اس کے جواب ،،زکوٰۃ ملی ہے'' نے چونکا دیا۔ یہ کیسی زکوٰۃ ہے جو استعمال شدہ کپڑوں میں تہہ در تہہ لپٹی ہے۔ ابھی یہ تجسس ابھر ہی رہا تھا کہ ماسی نے اس کو ختم کرنے کا ارادہ کر کے میرے سامنے رکھی میز پر ایک ایک کپڑا کھول کر رکھ دیا۔ ''ان کو درست کروانا ہے، اپنے ناپ پر''...... تب اس راز سے پردہ فاش ہوا کہ پرانے کپڑوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نے حیرت سے پوچھا کہ کیا یہ زکوٰۃ میں ملے ہیں' اس کے مثبت جواب پر میری زبان کچھ دیر کے لیے گنگ ہو کر رہ گئی۔

کوئی جواب نہ پا کر اس نے خود ہی بات کا سلسلہ جاری کر دیا، شاید اسے میری کیفیت کا اندازہ نہ ہو سکا کہ دسمبر کی سخت سردی میں مجھ پر گھڑوں پانی پڑ چکا تھا۔ ان سب باتوں سے بے نیاز اس کی توجہ اپنے کام پر تھی۔ ،،جس باجی کے ہاں میں کام کرتی ہوں، اس کی جسامت کافی بڑی ہے، اس لیے ان کپڑوں کو کاٹ کر فٹ کرنا پڑے گا۔'' اب میں نے اپنے آپ پر قابو پا کر ہمت کی کہ یہ آپ کو زکوٰۃ میں ملے ہیں؟ جس پر اس نے تفصیل بیان کی۔ میں ابھی تک سچ اور جھوٹ کے درمیان فیصلہ کرنے میں ناکام تھی۔ اس کی تصدیق کے لیے چند اور کام والیوں سے روزوں میں ملنے والے صدقات، خیرات اور زکوٰۃ کی تفصیل پوچھی تو انہوں نے کچھ اسی طرح کی کہانیاں سنائیں۔ نامناسب قدم کوئی ایک شخص اٹھاتا ہے۔ اس کی تقلید کرنے والے جنگل میں آگ کی طرح کام کرتے ہیں۔

انہی کے توسط سے معلوم ہوا کہ اس وبا کو عام ہوئے زیادہ وقت نہیں بیتا۔ اس کی جڑیں ابھی کمزور ہیں۔ اس کو اکھاڑ دینا کچھ مشکل نہیں لیکن جو اثرات پھیل چکے ہیں، ان کا سدِ باب ضروری ہے ورنہ ضعیف الاعتقاد لوگوں کے ہاں بہت جلد رواج پا جائے گا کیونکہ کچھ خواتین اس طرح کے عہدِ جلیلہ پر فائز ہونے کی وجہ سے معاشرے میں فتنہ پھیلانے میں مہارت رکھتی ہیں۔ اس کی وجہ

یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اگر وہ معاشرے میں اکیلی ہوں گی تو سب ان پر انگلی اٹھائیں گے، اس لیے ان کی کوشش ہوتی ہے کہ فتنے کو عام کر دیا جائے تا کہ سب ایک ہی رنگ میں رنگ جائیں۔ اجر و ثواب سے ان کا کچھ لینا دینا نہیں ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ قیامت پر یقین نہیں تو یتیموں مسکینوں کا حق کھانے والوں کو بدلے میں کیا ملے گا؟ اپنے دامن میں آگ بھرنے کا کسے شوق ہوتا ہے؟ اس زندگی کو سب کچھ سمجھنے والوں کا فلسفۂ حیات میری سمجھ سے بالاتر ہے۔

اس لیے دل میں کافی شکوک وشبہات نے جگہ بنالی کہ اتفاق سے ایک محفل میں اس طرح کے خیالات رکھنے والی خواتین سے ملنے کا موقع ملا تو اندازہ ہوا کہ انہوں نے اپنی منفی سوچ کی تشہیر کا خاطر خواہ بندوبست کر رکھا ہے کہ وہ اپنے ایک دو بار پہنے کپڑے آدھی قیمت لگا کر زکوٰۃ وصدقات میں دے دیتی ہیں اور شرمندگی کا کوئی آثار ان کے آس پاس نہ تھا بلکہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ پرمغز تبادلۂ خیالات ہو رہا تھا کہ چلیں کسی غریب کو فائدہ ہو جائے، ورنہ اس قیمت پر ان کو کہاں سے ملیں گے، ایک دو بار پہننے سے کپڑے خراب تو نہیں ہو جاتے۔ ان کے مطابق یہ کپڑے بیش قیمت ہیں۔ ان کی باتیں سن کر میری برداشت جواب دے گئی۔ جونہی میں ان کی طرف متوجہ ہوئی، میرا پرتپاک خیر مقدم تو کیا گیا لیکن میرے پہلے ہی تنقیدی جملے کو کڑوا کریلا سمجھ کر تھوک دیا گیا۔ میری دوسری کاوش بھی بے سود رہی۔ تب مجھے بخوبی علم ہو گیا کہ ''ایک کریلا دوسرا نیم چڑھا'' کا مطلب کیا ہے۔ ان کی آپس کی باتوں میں اس قدر تسلسل تھا کہ مجھے گفتگو میں شمولیت کا موقع ہی نہ ملا۔ مزید یہ کہ شور بے تحاشہ کہ اونچی آواز میں بات کیے بنا چارہ نہ تھا تو میں نے بات جاری رکھنے کا ارادہ ترک کر دیا لیکن ذہن پر امجد اسلام امجد کی غزل کے ایک شعر کا مصرع بارہا دستک دیتا رہا۔

میری عمر سے نہ سمٹ سکیں مرے دل میں اتنے سوال تھے

جن کا مجھے کہیں سے کوئی جواب نہ مل سکا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی برائی اس کو بری لگتی ہے جس کا ضمیر زندہ ہو۔ جن کا ضمیر لمبی تان کر سو جاتا ہے اور اسی کیفیت میں مردہ بھی ہو جاتا ہے، اگر اسے بروقت جھنجھوڑا نہ جائے تو پھر مردہ ضمیر پر اپنی تمام خواہشات کو مدعو کیا جاتا ہے اور ان کا الاؤ سلگایا جاتا ہے جس سے رنگ برنگی چنگاریاں پھلجھڑیاں بن کر فضا میں بکھر جاتی ہیں تو یہ مفلوج ذہن رکھنے والے لوگ بھول جاتے ہیں کہ اس سب کچھ کا مالک تو کوئی اور ہے، ہم اسی کو جواب دہ ہیں۔ ارشادِ

باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ''اور قائم کرو نماز کو اور دو زکوٰۃ اور رکوع کرو ساتھ رکوع کرنے والوں کے۔'' (سورۃ البقرہ۔ آیت: 43)

اسی مضمون کو تفصیل کے ساتھ اسی سورۃ میں ایک اور جگہ فرمایا۔

ترجمہ: ''نیکی یہی نہیں ہے کہ (نماز میں) اپنا منہ مشرق کو کرلو یا مغرب کو، نیک وہ شخص ہے جو اللہ پر ایمان لانے اور پچھلے دن (قیامت) پر اور سب فرشتوں پر اور کتاب (قرآن) پر (یا تمام آسمانی کتابوں) پر اور تمام پیغمبروں پر اور اللہ کی محبت سے اپنا پیسہ رشتہ دار اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور مانگنے والوں پر اور گردنیں چھڑانے میں خرچ کیا۔'' (سورۃ البقرہ: 177)

اسی طرح قرآنِ پاک میں متعدد جگہ زکوٰۃ کا بیان آیا ہے مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ میں نے کئی لوگوں سے پوچھا کہ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں؟ سب نے کہا الحمدللہ! کیوں نہیں۔ مگر جب تفصیل پوچھی تو بہت کم لوگوں کو اس مسئلے کا پتہ تھا۔ شاید اس کی ضرورت نہ دینے والوں نے کبھی محسوس کی ہے اور نہ ہی لینے والوں کو پڑی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے مرتبے کی بھی زکوٰۃ اسی طرح فرض کی ہے جیسا کہ مال پر فرض ہے یعنی ہر چیز کی زکوٰۃ ہوتی ہے۔ اگر انسان کے پاس علم ہے تو دوسروں تک پہنچا کر زکوٰۃ ادا کرے۔ عقل کی زکوٰۃ یہ ہے کہ جاہل کی بات سن کر خاموش رہا جائے۔ گھر کی زکوٰۃ مہمان نوازی میں ہے۔ زکوٰۃ کی حقیقت شکرانِ نعمت میں ہے جو اسی جنس کی نعمت کے ساتھ ادا کی جائے۔ جسمانی صحت بھی ایک نعمت ہے۔ اس کی زکوٰۃ عبادت میں مشغول رہ کر کی جاتی ہے۔ اللہ کے درویش بندے جن کے پاس کھانے کو کچھ بھی نہیں ہوتا، زکوٰۃ لینا پسند نہیں کرتے بلکہ اگر لینا بھی پڑے تو اس نیت سے کہ دنیاداروں کی گردنوں سے فرض کا بوجھ اتارنے میں ان کی مدد کریں۔ مولا علیؓ کا قول ہے کہ سخی پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی کیونکہ وہ اپنے پاس کچھ جمع نہیں رکھتا۔ اگر کوئی غریب یہ کہے کہ میرے پاس پیسہ نہیں، اس لیے مجھے مسائل جاننے کی ضرورت نہیں، درست نہیں۔ اس لیے کہ تحصیلِ علم فرضِ عین ہے اور علم سے لاتعلقی کا اظہار کفر ہے۔ واللہ اعلم!

6 جون 2018ء

گورنمنٹ کالج سرگودھا

''ہمیں انصاف چاہئے''...... یہ الفاظ کسی انسان کے نہیں بلکہ گورنمنٹ کالج سرگودھا کی دیواروں کے ہیں۔کیا دیواریں بھی بولتی ہیں؟ جی ہاں! اگر دیوارں کے کان ہو سکتے ہیں تو زبان کیوں نہیں، لیکن یہ ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آسکتی کیونکہ ان کی باتیں صرف گہری خاموشی اور مکمل سناٹے میں محسوس کی جاسکتی ہیں۔آہِ سرد و سرں تک مسلسل صبر کے ساتھ پہنچا کر انصاف کا انتظار کرنے والی یہ عمارت وقت اور حالات کے دیے درد کو خود ہی مرہم لگا کر امید کے روشن چراغ جلائے ہوئے ہے، اسی لیے اس کے حوصلے پست نہیں ہو سکے۔حال ہی میں میرا ریڈیو پروگرام کے سلسلے میں یونیورسٹی آف سرگودھا میں جانے کا اتفاق ہوا جو کبھی گورنمنٹ کالج سرگودھا کے نام سے علم کے آسماں پر قوسِ قزح کی طرح رنگ بکھیرتی ہوئی ایشیا کی سب سے بڑی درسگاہ تھی، آج اس کے شجر اپنے پتوں پر لکھے پیغامات وہاں آنے والے حساس دل کے مالک لوگوں کے قدموں میں ڈال کر اپنے تشخص کی دہائی دے رہے تھے۔سوشل میڈیا پر اس کے بارے بہت کچھ لکھا ہوا پڑھ کر حالات کا اندازہ پہلے سے ہو چکا تھا۔2002ء میں گورنمنٹ کالج سرگودھا کو اعزاز سے نوازتے ہوئے ''یونیورسٹی آف سرگودھا'' کا درجہ دیا گیا اور کچھ عرصہ بعد انٹر کلاسز کو بند کر دیا۔ اب سرگودھا کے عوام نے اس قتلِ عام کے خلاف احتجاج کیا اور ہر ذی شعور انسان نے اپنی استعداد کے مطابق حصہ ڈالنا ضروری سمجھا۔ایک اردو شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

سرِ محفل جو بولوں تو زمانے کو کھٹکتا ہوں
رہوں میں چپ تو اندر کی بغاوت مار دیتی ہے

میں نے اپنے ضمیر پر بوجھ محسوس کرتے ہوئے اس کارِ خیر میں شمولیت کا ارادہ کیا کہ کچھ واجب الادا ہے۔ اگرچہ اس موضوع پر بڑے بڑے ادیبوں نے قلم اٹھایا، مگر یہ سوچ کر لکھنا شروع کیا کہ بعض اوقات ننھی سی چنگاری شعلے سے زیادہ کام کر جاتی ہے۔سرگودھا کالج کی بحالی

کیوں ضروری ہے؟ یہ وہ درس گاہ ہے جہاں سے ہر سال ہزاروں کی تعداد میں طلبہ علم کی شمع سے روشنی حاصل کرتے ہیں اور باصلاحیت اساتذہ سے امیر و غریب یکساں مستفید ہوتے ہیں۔ اس کی انٹرمیڈیٹ کی کلاسز بند ہونے سے غریب اور سفید پوش ہونہار طلبہ کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ پرائیویٹ کالجز لاکھوں روپے فیس بٹور رہے ہیں۔ جو لوگ اخراجات برداشت نہیں کر سکتے، انہیں مجبوراً اپنے تعلیمی سلسلے کو خیر باد کہنا پڑتا ہے۔ وہ کس جرم کی سزا پاتے ہیں؟ غریب ہونے کی۔ جبکہ علم پر سب کا برابر حق ہے، یہ ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ قرآنِ پاک کی پہلی وحی سے ہو جاتا ہے:

ترجمہ: ''پڑھ ساتھ نام پروردگار اپنے کے جس نے پیدا کیا۔ پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون سے۔ پڑھ اور پروردگار تیرا بہت کرم کرنے والا ہے۔ جس نے سکھایا ساتھ قلم کے سکھایا انسان کو جو کچھ (وہ) نہیں جانتا (تھا)۔''

(سورۃ العلق۔ آیت: 1 تا 5)

اللہ تبارک و تعالیٰ نے جو ہمارے نبیؐ پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ذریعے پہلا پیغام بھیجا، وہ یہی حکم ہے کہ پڑھ اپنے رب کے نام سے۔ اب یہ والدین اور حکومتِ وقت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کا اہتمام کریں کیونکہ انسانیت کی اصلاح کے لیے تعلیم لازمی ہے۔ اس کے ذریعے ہم تباہی کی راہوں سے بچ کر فلاح اور سعادت کے راستے پر چل سکتے ہیں۔ اس لیے حکومت کے لیے ضروری ہے کہ سرکاری درسگاہوں پر نظرِ کرم فرما کر نظام کو بہتر بنائیں تاکہ تعلیم کے زیور سے سب کو سجنے کا موقع مل سکے۔ تعلیم نہ صرف دنیاوی زندگی کے لیے لازمی ہے بلکہ دینی اعمال کے لیے بھی لازمی ہے۔ اگر ہم ان پڑھ لوگوں کو وعظ و نصیحت سے سکھانے یا جہالت کے اندھیرے دور کرنے کی کوشش کریں گے تو کبھی کامیاب نہیں ہو سکیں گے بلکہ اس سے تفرقوں میں اضافہ ہوگا جس کی اسلام میں سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ آج کے دور میں جس چیز کے درمیان مقابلہ چل رہا ہے، وہ لمبی لمبی اونچی اونچی عالیشان عمارتوں کا ہے۔ تعلیمی معیار اور اساتذہ کی قابلیت و ذہانت کو بہت پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ جس طرح کی عمدہ بلڈنگ ہوگی، اسی کے مطابق فیس۔ یہ کاروبارِ زندگی سرگودھا میں اپنے عروج کو پہنچ چکا ہے۔ مزدور کے بچوں کو روٹی، کپڑا اور مکان نہیں ملتا، سکول کی فیس کہاں سے ادا کی جائے؟ دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ علم امراء کی میراث بنتا جا رہا ہے۔ جن باضمیر لوگوں

نے یونیورسٹی میں انٹر کی کلاس کے ختم ہونے پر اعتراض کیا، انہوں نے بھی اسی دلیل کے تحت کیا اوران کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ عدالت نے انٹر کالج کی بحالی کا حکم دے دیا ہے لیکن ابھی تک اس پر عمل نہیں کیا جاسکا۔ اس میں کس حد تک کامیابی ملتی ہے؟ یہ وقت بتائے گا۔ اچھائی کے راستے پر چلنے والوں کا فقدان نہیں بس مسئلہ یہ ہے کہ ہر ایک سوچتا ہے کہ ابتدا کوئی اور کرے۔

تمام مسائل کا حل ہمارے پاس ہوتا ہے لیکن اس کے لیے کچھ ہمت چاہئے۔ زندگی کے دامن میں پھول اور کانٹے دونوں ہوتے ہیں۔ کانٹوں سے دامن بچا کر پھول چننے کا ہنر آنا چاہئے۔ جو لوگ کانٹوں سے ڈرتے ہیں، وہ پھولوں کی مہک سے محروم رہ جاتے ہیں۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے اور محنت کا اس سے بھی زیادہ میٹھا۔ یہ انسانی جبلت ہے۔ وہ ہمیشہ آسان راستہ اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اللہ کے مقبول بندے راستے کا نہیں، منزل کا انتخاب کرتے ہیں۔ دنیا کی رنگینیوں کو اپنے پاؤں کی زنجیر ہرگز نہیں بننے دیتے۔ تبھی منزل خود چل کر ان کے قدموں میں آتی ہے۔

ربِ کائنات سے دعا ہے کہ جن لوگوں نے اس نیک کام میں حصہ ڈالا، انہیں کامیابی سے ہم کنار کر کے اجرِ عظیم عطا فرمائے اور اپنے لامحدود خزانوں سے نعمتیں اور برکتیں نازل فرمائے۔

آمین ثم آمین۔

23 جون 2018ء

یکم شوّال

شوّال کی پہلی رات کو ہمارے ہاں "چاندرات" کا نام دیا جاتا ہے جبکہ چاند تو ہر ماہ نیا نکلتا ہے۔صرف اسی ماہ کی پہلی رات کو ہی چاندرات کیوں کہا جاتا ہے؟ یہ نام کب اور کیسے پڑا؟اس بارے کبھی تحقیق کرنے کی زحمت نہ کی گئی کیونکہ ہر معاملے میں ہم لکیر کے فقیر ہیں۔ہاں!البتہ کوئی ان کے خلاف بات کرے تو پھر سب متحد ہوکراس کے ساتھ محاذ آرائی کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

اتفاق سے ایک بار چاندرات کو بازار جانا ہوا تو اور ہی سماں دیکھنے کو ملا۔دو گھنٹے پہلے ہم مسلمان تھے رمضان کے روزے رکھنے والے، اللہ سے ڈرنے والے، اس کی رحمتوں اور برکتوں کے حصول کی دعائیں کرنے والے، تلاوتِ قرآن پاک سے دلوں کا اطمینان حاصل کرنے والے، افطاری، صدقات، خیرات اورزکوٰۃ دینے والے......آخرایسا کیا ہوگیا کہ نئے چاند کے نظرآتے ہی ہمارے جذبات وعقائد کہیں رخصت ہوگئے؟مارکیٹ میں اتنا جمِ غفیر کیوں؟ میرے پوچھنے پر ایک سیلز مین نے بتایا کہ یہ سب چاندرات منانے کے لیے آئے ہیں۔چوڑیاں پہننے کا باقاعدہ پروگرام ہوتا ہے چاندرات کو، ویسے تو یہ باقی اشیاء کے ساتھ پہلے بھی خریدی جاسکتی تھیں، اگرایسا ہوتا تو یہ شوختم ہوجاتا۔گزرتے ہوئے چوڑیوں کی ایک دکان پراچانک نظر پڑی جہاں چند لڑکیاں اپنے ہاتھ سیلز مین کے ہاتھوں میں دینے کو جلدی دکھا رہی تھیں کہ پہلے مجھے پہنائیں، دوسری پہلے مجھے پہنائیں...... پہنانے والے نے پہلے سے ہی ایک ہاتھ چھوڑ کر دوسرا ہاتھ تھامنے کی مہارت حاصل کررکھی تھی۔اس لیے وہ بڑی پھرتی کے ساتھ اپنے کام میں مشغول تھا۔

یہ منظر دیکھ کر ایسا لگا کہ شوال کے چاند نے انسانی فطرت میں سوئے ہوئے سانپ اور ناگن صفت مخلوق کوشدّت سے جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا ہو۔خواہشات کے شکنجے میں جکڑے انسان رمضان جیسا بابرکت مہینہ پانے کے بعد بھی سدھر نہ پائے۔ایسے لوگوں نے رمضان کو دل سے کبھی قبول ہی نہیں کیا کیونکہ جو برائی کی طرف چلتا ہے، وہ اندر سے کبھی نیک ہوتا ہی نہیں۔بلکہ اس کے دل و

دماغ میں غلاظت کا بیج کہیں نہ کہیں موجود ہوتا ہے جو وقتاً فوقتاً انسانی سوچ میں ٹمٹماتا رہتا ہے۔

اس کی ایک بڑی وجہ ہمارے ناخواندہ مذہبی ٹھیکے دار ہیں جن کے سپرد ہم نے اسلام کر دیا۔ اس میں ان کا قصور نہیں بلکہ پڑھے لکھے لوگوں کی عدم دلچسپی کی وجہ سے وہ اس عظیم میراث کے مالک بن گئے۔ پھر رفتہ رفتہ بادِ مخالف کے جھونکوں نے ہماری تہذیب کی شمع بجھانے کی کوشش کی۔ اس طرح باقی مذاہب کے رسم و رواج کا رنگ ہم پر چڑھتا گیا اور اس ملمع کاری سے ہماری تہذیب بدلتی چلی گئی۔ ان کو الگ کرنا اب اُن مسلمانوں کی ذمہ داری ہے جو آج بھی ثابت قدمی کے ساتھ اپنی وضع قطع سے اپنا اسلامی تشخص برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی برائی پر مائل کرتا ہے تو اچھائی کی ترغیب بھی مل سکتی ہے۔ ہمارے اعمال ایسے نہیں کہ فرشتے مدد کو آ پہنچیں کیونکہ نفس جب شر پر گامزن ہو تو شیطان متحرک ہوتا ہے۔ اپنے اپنے تخلیق کردہ فلسفہ کے پیچھے ہم کبھی جاتے نہیں کہ یہ ہمارے مذہب میں کب اور کہاں سے شامل ہو گئے؟ کس معاشرے سے داخل ہوئے؟ ہمارا مذہب ان کے بارے میں کیا کہتا ہے؟ سچ اور جھوٹ میں فرق جاننا ضروری ہے۔

ہمیں یکم شوّال کی اہمیت کا اندازہ ہوتا اگر کبھی توجہ دیتے کہ اس رات کو اللہ کے حکم سے فرشتوں کا نزول ہوتا ہے جو روزہ داروں کے لیے انعام و اکرام لے کر آتے ہیں۔ جنہوں نے پورا مہینہ اللہ کے حکم کے مطابق گزارا ہو، ان کا انعام تو بنتا ہے اور جب مالک خوش ہو کر نوازتا ہے تو کیسے نوازے گا، ہماری سوچ کی پرواز اتنی نہیں کہ سمجھ سکیں۔ یہ رات اپنا جائزہ لینے کی رات ہے۔ انسان جب اپنا جائزہ لیتا ہے تب باطن کی خباثت، حرص، لالچ، خود غرضی اور ظلم و ستم اُبل کر وجودِ انسانی سے باہر آ جاتے ہیں۔ اس کی ذات اپنی نظروں کے سامنے اشرف المخلوقات کی اصلیت کو عیاں کر دیتی ہے اور وہ اپنی روداد کو احساس کے پیمانے پر پرکھتا ہے۔ اس پر واضح ہوتا ہے کہ وہ کہاں ٹھیک اور کہاں غلط تھا؟ کتنے روزے بارگاہِ رب العزت میں قبول ہوئے اور کتنے وہ اپنی غلط عادتوں کی وجہ سے مکروہ کر بیٹھا؟ کب اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کو مدد کے لیے پکارتا رہا؟ کس جگہ شرک کا مرتکب ہوا؟ بے شک وہ غفور الرحیم ہے لیکن اس کے ساتھ وہ جبار و قہار بھی ہے۔ اس کا ذکر قرآنِ پاک میں اس طرح آتا ہے۔

ترجمہ: ”اے نبی! میرے بندوں کو خبر دے دیں کہ میں بہت درگزر کرنے والا اور رحیم ہوں مگر اس کے ساتھ میرا عذاب بھی نہایت دردناک

عذاب ہے۔" (سورۃ الحجر۔ آیت: 50-49)

انسان جب اللہ تعالیٰ کی طرف ایک قدم بڑھاتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم فرماتے ہیں کہ اس کی مدد کو پہنچو اور صراطِ مستقیم پر چلنے میں اس کی رہنمائی کرو اور اللہ سے رخ موڑنے والے کی راہ تاریک سے تاریک تر ہو جاتی ہے۔ جہاں خیروشر کے درمیان امتیاز کرنا اس کے بس میں نہیں اور وہ اندھیروں کی وادیوں میں اترتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ پوری طرح گمراہ ہو جاتا ہے۔ پھر اس کو اچانک پکڑتا ہے اور سنبھلنے کا موقع نہیں دیتا۔ کچھ راتیں اور کچھ دن اس نے مخصوص کر دیے ہیں تاکہ انسان اللہ کی راہ پر چل نکلے۔ ایک رات کا ذکر قرآنِ پاک میں لیلۃ القدر کے نام سے ہے۔ یہ رات ہزار راتوں سے بہتر ہے۔ اگر ہم صرف پانچ طاق راتیں جاگ لیں تو ہزار مہینوں کی عبادت ان پانچ راتوں میں کر سکتے ہیں۔ اپنے رب کے سامنے اقرارِ جرم کرنے اور آئندہ گناہ سے بچنے کا عہد کر کے دل کا بوجھ کم کر سکتے ہیں کیونکہ وہ قوت کو بدل سکتا ہے۔ برائی کی طاقت کو کمزور کر کے بھلائی کو پروان چڑھائے گا، وہ لوگ جن کو نیکی کی توفیق نہیں ہوتی کم از کم گناہوں سے بچنے کی کوشش کریں کیونکہ اگر اس رات کو ایک گناہ بھی سرزد ہو جائے وہ بھی ہزار مہینوں کے گناہوں کے برابر ہوگا، پورا رمضان ہم راتوں کو جاگ لیتے ہیں۔ اگر ایک رات اور اسی طرح گزار لیں تو کتنی برکتوں والی رات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اپنا جائزہ لے کر جہاں کہیں خطائیں ہوئیں، جان بوجھ کر یا بھول کر، اس کے لیے رب العزت کے سامنے اقرارِ جرم کر کے اپنی غلطیوں کی معافی مانگ سکتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو اس رات کی اہمیت کا علم ہی نہیں ہوتا جو اس بات سے واقف ہیں۔ ان کو چاہئے کہ حتی الوسع کوشش کریں اور دوسروں کو اس رات کی برکات سے آگاہ کریں تاکہ کسی اور کو فائدہ اٹھانے کا موقع مل سکے۔ بالکل اسی طرح اس رات کا بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کیونکہ اسے کوئی مخصوص نام نہیں دیا گیا بلکہ یہ تو اس کی خصوصیت کی بنا پر چاند رات کو جائزہ لینے کو کہا ہے۔ اس رات کو چند ہزار فرشتے زمین پر نازل ہوتے ہیں اور وہ ندا کرتے ہیں کہ اے اللہ کے بندو! خوشخبری ہو تم کو اس بات کی کہ بخش دیا تم کو اللہ تعالیٰ نے واسطے اس کے رکھے تم نے روزے، بے شک اس کا ہر وعدہ سچا ہے اور وہ ایسا ہی کرے گا بے شک۔

آمین ثم آمین۔

28 جون 2018ء

توہینِ محبت

روئے زمین پر آتے ہی انسان اور محبت کی رفاقت کا آغاز ہوا اور ابد تک رہے گا۔ محبت ہے کیا؟ ہر دور میں سخن شناس اشخاص نے اپنے حسنِ ذوق اور وسعتِ نظر کے مطابق اس کی تعریف پر طبع آزمائی کی، حیاتِ انسانی میں اس پر بصیرت افروز تعریف وتنقید کا سلسلہ جاری رہا، اس طرح محبت نے ہر دور میں سب کی توجہ اپنی طرف راغب کروائے رکھی، اختلافاتِ نظریات کے باوجود ہر تعریف کو کہیں نہ کہیں شہرتِ دوام حاصل ہوتی رہی۔ اس موضوع کی وجہ سے مصنف حیاتِ جاوید پا جاتا۔ شعور واحساس کی پختگی کے ساتھ ترمیمی خیالات کا آنا لازمی امر تھا۔ شعرائے کرام نے اس کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ علامہ محمد اقبالؒ اس کی تعریف میں کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفاں حلال لذتِ حاصل حرام

عدؔم کچھ یوں لکھتے ہیں۔

محبت کے مسائل، نازک و دشوار ہوتے ہیں
بڑی دقت سے روٹھے دلربا ہموار ہوتے ہیں

پھر تلخئ ایام نے غمِ یار کو غمِ روزگار سے کہیں پیچھے دھکیل دیا۔ اس طرح خودفراموشی کے اس جذبے کا وجود نحیف پڑ کر زندہ دلی میں بدلنے لگا، محبت پر ان لوگوں کی اِجارہ داری ہونے لگی۔ جو دولت سے مالا مال تھے، انہوں نے اظہارِ محبت کے طریقوں کو بدل کر رکھ دیا۔ جس کے نتیجے میں تاج محل جیسے عجوبے وجود میں آنے لگے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے ادباء وشعراء نے اس کا ذکر اپنی تحریروں میں شامل کرنا شروع کر دیا۔ رفعت سلطانؒ اس کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

احباب کا مزاج اگر تاجرانہ ہے
میں کس لیے سناؤں محبت کی داستاں

لیکن کچھ الفاظ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو کوئی بدل نہیں سکتا، نہ ان میں تبدیلی آسکتی ہے اور وہ الفاظ رَبِ ذُوالجلال کے ہیں۔ قرآنِ مجید فرقانِ حمید میں محبت کا ذکر اس طرح آتا ہے:

ترجمہ: ''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے شائستہ اعمال کیے ان کے لیے اللہ رحمٰن محبت پیدا کردے گا۔'' (سورۃ مریم۔ آیت:96)

مفسرین لکھتے ہیں کہ جب اللہ کسی بندے سے محبت کرتے ہیں تو جبرائیل آمین ؑ کو فرماتے ہیں کہ اے جبرائیل! ○ میں فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں، تم بھی اس سے محبت کرو۔ چنانچہ جبرائیل ؑ آمین بھی اس کو محبوب سمجھنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد جبرائیل ؑ آسمان والوں سے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں بندے کو محبوب بنالیا ہے، اے آسمان والو تم بھی اسے محبوب سمجھو پھر زمین والوں سے فرماتے ہیں تو زمین والے بھی اسے محبوب سمجھنے لگتے ہیں۔ واضح رہنا چاہئے کہ اللہ کی محبت بندے کے لیے ضروری ہے۔ اب اس لفظ کے معنیٰ کی طرف آتے ہیں۔

لفظ ''محبت'' عربی زبان کے لفظ ''حبہ'' سے ماخوذ ہے۔ اہلِ لغت کے مطابق لفظ حبہ سے حبتہ نکلا ہے جس کے معنی تخم (بیج) کے ہیں جو زمین پر گرتا ہے، بارش برسنے سے پہلے زوردار آندھی آتی ہے جس سے درختوں، پودوں اور جڑی بوٹیوں کے بیج تیز ہوا کے ذریعے دور تک چلے جاتے ہیں۔ پھر یہی بیج بگولوں کی وجہ سے مٹی میں دب جاتے ہیں۔ ربِ کائنات اس پر آبیاری کرتا ہے اور اس پر موسم کے تغیرات اثر انداز نہیں ہوپاتے۔ جیسے ہی اس کے اُگنے کا موسم آتا ہے تو بارانِ رحمت کے بعد دھوپ کی تمازت اور گرمی کی شدت سے زیرِ زمین دبا بیج مخصوص وقت پر پھٹ کر پودے کو جنم دیتا ہے۔ پھر یہ پودا مختلف مراحل طے کر کے پھول و پھل دینے کے قابل ہوتا ہے۔ اسی طرح محبت کا بیج دل میں حدت و شدت برداشت کیے بغیر نہیں اُگتا۔ پھر بندہ اس مقام تک پہنچتا ہے کہ اسے مشقت، لذت میں فرق محسوس نہیں ہوتا۔ اہلِ لغت میں کچھ اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ محبت حب سے مشتق ہے اور حب وہ دانہ ہے جس میں پانی کثرت سے بھرا ہو، اوپر سے ایسا محفوظ ہو کہ چشموں کا پانی اس میں داخل نہ ہوسکے یہی حال جذبہ محبت کا ہے، جب وہ طالب کے دل میں جاگزیں ہوجائے اس کا دل بھر جاتا ہے اور کسی جذبے کیلئے جگہ باقی نہیں رہتی۔ یہ قرآنی اور ادبی تعریفیں تھیں جو اللہ اور اس کے بندوں نے کیں۔ اب موجودہ دور میں محبت کیا اور اظہارِ محبت کیا؟ دورِ جدید نے باقی تمام اشیاء کی طرح جذبوں میں بھی جدت پیدا کر

دی ہے۔ وہ پرانی خالص محبت ملنا در کنار، اس کی تعریف بھی نہیں ملتی۔ یہاں بھی ملاوٹ کا بازار گرم ہے۔ کرپشن کا آغاز شاید اسی سے ہوا۔ جوانی وہ دور ہے جب انسان کی جسمانی نشوونما مکمل ہو جاتی ہے۔ عدمؔ اس دور کے جوانوں کے لیے فرماتے ہیں:

جوانی ایک نادانی ہے نادانی مسرت ہے
مسرت کے لبوں پر ہوش کی باتیں نہیں ہوتیں

موجودہ دور میں محبت محض دولت کی معاونت سے حسن و دلکشی سے ہوتے ہوئے ہوٹلوں، ریستورانوں کے کھانوں، بیش قیمت تحائف، شاپنگ اور مہنگی گاڑیوں میں سیر سپاٹے کی مرہون منت ہو کر رہ گئی ہے۔ ماضی کا اصولِ محبت ''محبوب کی خوشی میں آپ بھی خوش'' اب متروک ہو گیا ہے۔ دولتمندوں کو یہ چونچلے ایک آنکھ نہیں بھاتے بلکہ اپنے لیے خوشی قیمتاً خریدنے کو ترجیح دیتے ہیں اور جو اس کی سکت نہیں رکھتے، ان کا نسخہ ہے ''ایک تعویز سے محبوب آپ کے قدموں میں''، فلمی محبتیں تو مزاروں اور درباروں پر بآسانی دستیاب ہیں اور ہمارا معاشرہ اس کی اندھی تقلید میں کوشاں ہے۔ انتہائی کمزور ایمان کے حامل ان لوگوں کا اللہ پر بھروسہ نہیں۔ ان سے التماس ہے کہ پیشہ ور مفرور مجرموں کو قانون کے شکنجے میں لانے کیلئے بھی تعویذ گنڈوں کا استعمال کیا کریں تاکہ انہیں کیفرِ کردار تک پہنچایا جاسکے۔

کیا کسی کے دل میں تعویز گنڈوں کے ذریعہ جگہ بنانے کی کوشش محبت ہے؟ وہ لوگ جو اپنی تمام تر کوشش کے باوجود اس تک رسائی نہیں پاسکتے، وہ سکونِ محبت کہاں تلاش کرتے ہیں؟ تمباکو نوشی، شراب و کباب، گانوں کی محفلوں اور فلموں میں...... برائی جس دل میں ہو، وہاں یہ احساس پیدا نہیں ہوسکتا۔ میرے خیال کے مطابق چیف جسٹس کو اس پر بھی از خود نوٹس لینا چاہئے کیونکہ یہ جذبہ محبت نہیں توہینِ محبت ہے جبکہ محبت دوسرے کی منشا کے مطابق خود کو ڈھالنے کا نام ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

17 جولائی 2018ء

افسر شاہی

ابتدائے آفرینش سے تا بہ ابد تک تمام نعمتیں عطا کرنے والی ذاتِ بابرکات نے انسان کو فہم و ادراک کے خزانوں سے نواز کر اپنی پہچان کروانے کی صلاحیت دی، ہر معاشرے کی اپنی علاقائی، معاشی، معاشرتی، ماحولیاتی، موسمی تغیر و تبدل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک تہذیب بنتی ہے اور ہر تہذیب کی اپنی ضروریات ہوتی ہیں۔ بالکل یہی حال امراض کا ہے۔ کچھ موسمی، کچھ علاقائی، کچھ وبائی، کچھ انفرادی، کچھ اجتماعی اور کچھ موروثی بھی ہوتی ہیں لیکن ہمارے ارضِ پاک میں ایک مرض ایسا بھی ہے جو انفرادی بھی ہے، اجتماعی، موروثی اور علاقائی بھی ہے۔ موسم جو بھی ہو، اس پر پورا سال بہار ہی رہتی ہے، نہ مرجھاتا ہے، نہ کملاتا ہے۔ یہ موذی مرض سرطان سے زیادہ خطرناک ہوتا جا رہا ہے۔ یہ مرض افسر شاہی کا ہے، سرطان سے خطرناک......اس لیے کہ تعلیم یافتہ تو درکنار ناخواندہ کی بھی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اسے کوئی بڑا سرکاری عہدہ مل جائے اور آئے روز اس میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ سب کو اپنی تقدیر بدلنے کا ایک ہی راستہ نظر آتا ہے اور وہ سرکاری نوکری ہے۔ اس ذہنی فتور کی ابتدا کیسے اور کہاں سے ہوئی؟ آئیں اس پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

جمہوریت کے گن گانے والے حکمرانوں نے اداروں کو اس قدر ضعیف و نادار بنا کر غلام بنا لیا کہ ایک چھوٹا سا سرکاری ملازم اپنے بڑے افسر کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا ہے کہ میرا فلاں وزیر یا مشیر سے رابطہ ہے، اس لیے وہ کام اپنی مرضی سے کرے گا اور تنخواہ پھر بھی مل جائے گی۔ پٹواریوں کی یہ موج و مستی دیکھ کر محنت کشوں کے دل میں لالچ پیدا ہوا اور وہ بھی محنت سے جی چرانے لگے۔ جو خود اس دوڑ میں شامل نہیں ہو سکتے، اپنے بچوں کو شامل کر دیتے ہیں۔ مایوسی کی ندی میں غوطہ خوری کی مشق جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنی اولاد کو شروع سے ہی افسر شاہی کے خواب دکھا کر کام چوری کا درس دیا جاتا ہے۔ تعلیمی اداروں میں بھیجتے وقت بچے کو اپنے اردگرد کے

لوگوں میں سے کسی صاحبِ حیثیت انسان کی مثال دے کر کہا جاتا ہے کہ آپ نے اس جیسا بننا ہے۔ کسی اچھی بات کی تقلید کرنا سمجھ میں آتا ہے لیکن یہاں افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ جس کی پیروی کرنے کی تربیت دی جاتی ہے، اس کے منفی اور تکبرانہ انداز کو خاص طور پر اہمیت دی جاتی ہے۔ آج اس نے یہ کیا، کل کو کسی مقام پر پہنچ کر بدلہ ضرور لینا۔ اس طرح نئی نسل انتقامی جذبے کا بیج دل میں بو کر، شرافت کا لبادہ اوڑھ کر اپنی کسمپرسی کی زندگی سے ہی دن رات اس تصوراتی دنیا میں رہنا شروع کر دیتی ہے۔ اپنے آباؤ اجداد کے پیشے سے انہیں دور رکھا جاتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے خاندانی ہنر سے محروم رہ جاتے ہیں۔ دوسرا ان کے دماغ میں یہ بات گھر کر جاتی ہے کہ ان کا وراثتی ہنر باعثِ شرم ہے جس سے انہیں دور رہنا ہے۔

یہاں والدین اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مارنے کے محاورے پر عمل کرتے نظر آتے ہیں۔ ہر بچہ اس مقام پر نہیں پہنچ پاتا جو اس کے والدین چاہتے ہیں لیکن اسے کوئی متبادل رستہ دکھایا نہیں جاتا جس کی وجہ سے ناکامی کی صورت میں نہ وہ اِدھر کا رہتا ہے نہ اُدھر کا۔ اس صدمے کے بعد والدین اپنا سارا غصہ اس پر نکالتے ہوئے اپنے اس پیشے کو اپنانے کا حکم صادر کرتے ہیں جس سے نفرت کا تخم وہ خود بو چکے ہوتے ہیں۔ اب یہ انسان کدھر جائے؟ گھر کے ماحول سے تنگ آ کر بے روزگاروں کی صف میں شامل ہو کر تخریب کاری کی طرف مائل ہو جائے گا۔ اس میں قصور وار کون؟ وہ والدین جنہوں نے اپنے بچوں کو اپنے پیشہ سے دور رکھنے کے ساتھ ساتھ حقارت کی نظر سے بھی دیکھا۔ ہنر اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت ہے لیکن انسان اتنا ناشکرا ہے کہ اس کی قدر نہیں کرتا۔ شاید وہ جانتا نہیں کہ اگر کوئی ہنر سکھا دیا جائے تو بہتر سے بہترین کی طرف بھی سفر کیا جا سکتا ہے۔ کچھ کرنے کے قابل تو ہوتا ہے۔ اسی گروہ کے کچھ بچے محنت و مشقت کر کے اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں کہ مقابلے کا امتحان پاس کر سکیں۔ اگر حادثاتی طور پر وہ کامیاب ہو بھی جائیں تو ان سے یہ نئی عزت اور شہرت سنبھالی نہیں جاتی۔ چاہے جتنی ہی کوشش کریں، اپنی حرکتوں سے پہچانے جاتے ہیں کیونکہ جو خاندانی رئیس ہوتے ہیں، ان کے رویے ان کی پہچان کروا دیتے ہیں۔ وہ مزاج نرم رکھتے ہیں لیکن نئے امیر اِن عادتوں کے عادی نہیں ہوتے، ان کا لہجہ ہی بتا دیتا ہے کہ دولت نئی نئی ہے۔

اس نشے سے سرشار اپنی نئی زندگی کا آغاز اس طرح سے کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی خاندانی

تاریخ کو نذرِ آتش کر دیا جائے تاکہ آغازِ سفر کا نشان مٹ جائے لیکن یہ وہ تاریخ ہے جو اِن کے دل و دماغ پر لکھی جا چکی ہے۔ جیسے ہی مماثلت پانے والے کسی انسان کا ذکر ہوتا ہے، وہ خود کو ماضی کے اس کٹہرے میں کھڑا محسوس کرتے ہیں۔ اوروں کے لیے استعمال ہونے والے الفاظ بھی اپنے زخموں پر مرچ کا کام کرنے کا احساس دلاتے ہیں اور قلبِ سلیم میں افراط و تفریط کا عمل جاری ہو کر تمام تر تاروں کو چھیڑ جاتا ہے۔ اس وقت انسان دہری شخصیت کا مالک بن کر اضطراب کی کیفیت میں پہنچ جاتا ہے۔ ایک وہ جو ہمارے سامنے ہوتی ہے۔ دوسری اس وقت باطن میں وقوع پذیر ہونے والے حادثات سے جنگ و جدل میں مصروف ہوتی ہے۔ کچھ لوگ اپنے اوپر مضبوط خول چڑھا کر فطرت سے لڑ کر باطنی کیفیت کو مکمل طور پر چھپا لیتے ہیں اور کچھ کمزور پڑ کر اپنی اصلیت دوسروں پر ظاہر کر بیٹھتے ہیں۔ اس بے حجابی سے معاشرے اور لوگوں کے دلوں میں پائی جانے والی عزت سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ اس موڑ پر پھنس جانے والوں کو نہ اسلام کے آداب یاد رہتے ہیں، نہ زمانۂ جاہلیت کے اخلاق اور نہ معاشرے کے شریفانہ طور طریقے۔ اس اونچی اڑان کے شوقینوں کو زمین پر چلنے پھرنے والے لوگ بہت چھوٹی مخلوق نظر آتے ہیں۔ ایسی سوچ رکھنے والے ان لوگوں کے لیے مزید تکلیف کا باعث بنتے ہیں، کبھی جو اِن کے ساتھ تھے اور کسی خاص مقام پر نہیں پہنچ پائے۔ اپنی افسر شاہی کے نشے کی وجہ سے ماضی کے ساتھیوں کو اچھوت سمجھنے والوں کی کمی نہیں۔ اس طرح کے لوگوں کے رویے دیکھ کر میں سوچتی ہوں کہ کیا انہوں نے کبھی ڈوبتے سورج کو نہیں دیکھا جو روزانہ ہمیں ایک پیغام دے جاتا ہے۔

کرنا کبھی غرور نہ اپنے عروج پر
اک آفتاب ڈوب کے ہم کو بتا گیا

ایسے لوگ نہ صرف دوسروں کے ساتھ بلکہ اپنے ساتھ بھی ظلم کرتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ان جیسے لوگوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ترجمہ: ''پس کاٹی گئی جڑ اس قوم کی کہ جو ظلم کرتے تھے اور سب تعریف واسطے اللہ کے، ہے۔ پروردگار عالموں کا۔'' (سورۃ الانعام۔ آیت: 45)

چونکہ ہمارا یہ گھر فانی ہے، سانسیں گنتی کی ہیں، فنا ہونے والی شے پر اترانا جہالت کی علامت ہے، گنتی کی سانسوں پر دل لگانا غفلت ہے، پھر بدلتے حالات کے ساتھ خواہشات کا طوفان امڈ

آتا ہے جن کو ضرورت کا نام دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ رشتے بھی ضرورت کے مطابق ہیں۔

سب ضرورت کے رشتے مراسم یہاں
بس سبق اک یہی تو سکھاتی رہی

تکبر کو علم اور ریا کاری کو تقویٰ کی علامت سمجھنے والے اپنی اوقات بھول جاتے ہیں۔ اہلِ دنیا کی آفتوں کو خوشی سے گلے لگا کر شریعت کو نظر انداز کرنے لگتے ہیں۔ ان کے اعمال کو دیکھ کر قدرت حرکت میں آ کر اپنی گرفت میں لے لیتی ہے جس کو ہمارے ہاں نظرِ بد کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ اصل میں نظر بد نہیں، افعالِ بد کا نتیجہ ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسا دے دیا جو دوسروں کو نہیں دیا، اس پر سجدہ شکر ادا کرنے کے بجائے دوسروں پر ظلم کے پہاڑ توڑنے والے ایک دن خود اس کے نیچے آ کر دب جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہماری قوم کو عقل و شعور دے، اس کمپلیکس کے سکون لیوا مرض سے نجات دے اور محنت و مشقت سے رزق حلال کمانے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین۔

27 جولائی 2018ء

زندگی کے حقیقی رنگ

لوڈشیڈنگ سے جہاں کاروبارِ زندگی بند ہوتا ہے، وہاں سکونِ زندگی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ بجلی کی بندش سے شور شرابہ ختم ہوتے ہی ہر طرف خاموشی کا راج ہوتا مگر ایسا نہیں کیونکہ جب باقی اشیائے زندگی بند ہوتی ہیں، وہاں بچوں کے کارٹون چینل بھی بند ہو جاتے ہیں۔ دوسرا وہ شو جہاں ڈیزائنرز اپنے فن پاروں کی نمائش کرتے دکھائی دے رہے تھے، ادھورے رہ جاتے ہیں۔ گھر میں بیٹھی خواتین کے لیے ذہنی کوفت کا باعث بنتے ہیں کیونکہ وہ اتنے شوق سے دیکھتی ہیں جیسے کل اس کو ضرور زیبِ تن کرنا ہو۔ ان میں سے اکثر و بیشتر ساتھ ساتھ استغفار کا ورد بھی جاری رکھے ہوتی ہیں ''استغفر اللہ! ایسے لباس پہننے والوں نے مرنا نہیں ہوتا، اللہ کو کیا منہ دکھانا ہے؟'' یہ کلمات ان کے ہوتے ہیں۔ جنہیں یقینِ کامل ہو کہ وہ زندگی میں کبھی ایسا لباس خریدنے یا پہننے کی حالت میں نہیں آسکتیں تو چلو انگور کھٹے ہی سہی، اور دیکھ دیکھ کر اندر کی حسرتیں اندر ہی دم توڑتی ہیں۔ ان مردہ حسرتوں کی نعش گل سڑ کر دماغ میں راکھ کی مقدار میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔ پھر اس کچرے کے گودام میں مثبت سوچیں آٹے میں نمک کے برابر ہونے سے اپنا وجود کھو بیٹھتی ہیں اور ہر طرف اضطراب کا راج شروع ہو جاتا ہے جس سے گھر کے ماحول میں تبدیلی آنے لگتی ہے۔ وہ خود ترسی کی کیفیت میں چلی جاتی ہیں کہ دنیا کہاں جا رہی ہے اور ہم کہاں کھڑی ہیں۔ اصل میں دنیا کہیں نہیں جا رہی، وہیں کی وہیں کھڑی ہے، بس ہمارے دیکھنے کے انداز بدل گئے ہیں......

ٹی وی شو میں جو کچھ دکھایا جاتا ہے، وہ ہمارے معاشرے کے دو فیصد لوگوں کا ماحول ہوتا ہے۔ اب یہ فیشن اِن ہو گیا، اب یہ آؤٹ ہو گیا...... مارننگ شو میں اکثر چینل پر اس قسم کے پروگرام دیکھنے والوں کے زخموں پر نمک کا کام کرتے ہیں۔ مہمان اور میزبان دونوں اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ ڈالنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑتے۔ اس تصوراتی ماحول کو حقیقت کے قریب کر

دیتے ہیں۔ ''ہم ہمیشہ فلاں برانڈ استعمال کرتی ہیں'' اور کچھ اس سے بھی چار قدم آگے نکل جاتی ہیں۔ ''جی میری ساری خریداری پاکستان سے باہر ہوتی ہے۔ یہاں ملتا ہی کیا ہے؟ کچھ خاص نہیں۔'' یہ کس کی توہین ہے؟ اپنی...... ایسی گفتگو کرنے والے لوگوں کا جوش و جذبہ 14 اگست کو بھی دیدنی ہوتا ہے جب وہ حب الوطنی کے گیت گاتے، سبز و سفید رنگ کے لباس میں لپٹے چلتے پھرتے پرچمِ پاکستان نظر آتے ہیں۔ میرا کہنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ یہ سب وہ دکھاوے کے لیے کرتے ہیں بلکہ یہ جذبہ ان میں کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوتا ہے کیونکہ جب کبھی وطنِ عزیز کو کسی قربانی کی ضرورت پڑی تو عوام میں سب سے پہلے یہی طبقہ خود کو پیش کرتا ہے۔ اس طرح ڈراموں اور فلموں کے ہیروز اصلی ہیروز کا روپ دھار لیتے ہیں۔ میل اور فی میل دونوں کا بھرپور کردار ہوتا ہے۔ ان کی ذات میں اتنی لچک ہوتی ہے کہ وقت اور حالات کے ساتھ خود کو بدل سکیں اور ہونا بھی یہی چاہیے۔ اگر پانی ایک حالت میں رہے تو وہ بھی خراب ہو جاتا ہے مگر ان کے ٹاک شو دیکھنے والوں میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ اس تبدیلی کا مظاہرہ کر سکیں۔

ان کی پوری زندگی اسی سٹیج پر نہیں گزرتی۔ اس لیے اپنی عقل کو استعمال کرنا چاہیے کہ کس میں ہمارا فائدہ اور کس میں نقصان ہے؟ جہاں تک بات برانڈ کی ہے، ہمارے ملک میں ہنر کی کمی نہیں۔ انسان کا دماغ ایک قدرتی کان کی طرح ہے جس سے خزانے نکالے جا سکتے ہیں۔ جس کو کان کنی کا جتنا فن آتا ہے، وہ اسی کے مطابق اس قدرتی ذخیرے سے استفادہ کر سکتا ہے۔ یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ اس دولتِ بے حساب کا استعمال کر بھی سکتا ہے یا نہیں؟ جنہیں یہ صلاحیت مل جائے، وہ لوگ آگے مختلف گروہوں میں منقسم ہو جاتے ہیں۔ ایک گروہ یہ سوچ رکھتا ہے کہ اپنا ہنر ان لوگوں کے لیے ہے جن کے پاس پیسے کی قلت ہو۔ اگر پیسہ ہے تو پھر دماغ استعمال کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ پیسہ ضرورتیں پوری کرتا ہے، شوق نہیں۔ دوسرا طبقہ جن کے حالات ان کو برانڈ مافیا کی اجازت نہیں دیتے، پھر بھی وہ لوگوں کی نظروں میں اپنا مقام اونچا رکھنے کے لیے صرف مہنگے لباس اور چیزوں کو ہی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کی اپنی ذات کہیں پیچھے رہ جاتی ہے جو حقیقی معنوں میں عزت دلوا سکتی ہے۔ خود کو سدھارنے کی فکر سے آزاد ہو کر سوچتے ہیں۔ اس غلط نظریہ کی وجہ سے کبھی اس عروج تک نہیں پہنچ پاتے جن کا تصور کرتے ہیں۔ یہ سب فریبِ ذات کا نتیجہ ہے۔ حسن و عزت کا تعلق رنگ و لباس سے بالکل نہیں ہوتا۔ اگر کسی انسان کی سوچ اچھی ہو تو

اس کو ظاہر کرنے کیلئے مناسب الفاظ اور خوبصورت لہجے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح کوئی ایک خوبی اس وقت تک اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی جب تک اس سے متعلق تمام چیزیں اپنے مناسب مقام پر نہ ہوں۔

معیار بدلنے سے خریدار بھی بدل جاتے ہیں۔ عورت نے محبت کو دولت میں تلاش کرنا شروع کیا تو مرد نے دل کے عین اوپر جیب لگوالی۔ مرد نے ظاہری حسن کو اہمیت دی۔ عورت نے سادگی کو اللہ حافظ کہہ کر خود کو بناؤ سنگار میں چھپالیا اور دونوں کے قدرتی اوصاف لحاف اوڑھ کر سو گئے۔ خوبصورتی کس کو پسند نہیں مگر زندگی کا حقیقی حسن کس میں ہے؟ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

ترجمہ: ''مرد قائم رہنے والے ہیں۔ (یعنی حاکم ہیں) اوپر عورتوں کے بہ سبب اس کے کہ بزرگی دی اللہ نے بعضے ان کے کو، اوپر بعض کے اور بہ سبب اس کے کہ وہ خرچ کرتے ہیں۔ مالوں اپنے سے پس نیک بخت عورتیں فرمابردار ہیں نگہبانی کرنے والی ہیں۔ پیچ غائب کے ساتھ محافظ اللہ کے۔''

(سورۃ النساء۔ آیت:34)

اللہ تعالیٰ نے خانگی شیرازہ بندی کے لیے مرد کو گھر کا قوام (نگران، ذمہ دار) قرار دیا ہے۔ عورت کو صنفِ نازک ہونے کی وجہ سے اس کے ماتحت رکھا۔ مرد کو طبعی طور پر یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ گھر کے اخراجات، نان ونفقہ سمیت سب پورے کرے۔ بیوی کی ذمہ داری کیا ہے؟ ایک حدیثِ پاک کے مطابق اچھی بیوی وہ ہے جس کو دیکھ کر شوہر خوش ہو اور اپنے شوہر کے حکم کی اطاعت کرے اور اس کی عدم موجودگی میں گھر مال اور اپنی عزت ونفس کی حفاظت کرے۔ اس طرح دونوں کو اپنا اپنا مقام دیا۔ مرد کو عورت کے ساتھ حسنِ معاشرت کا حکم دے کر اور عورت کو گھر، مال، عزت وآبرو کی حفاظت کا، اور ان میں خیانت نہیں کرنی، اگر کوئی کرے گا، تب بھی دوسرے سے پوچھا جائے گا کہ آپ نے اپنا فرض پورا کیا۔ ہر ایک نے اپنا حساب دینا ہے۔ فرائض کا الگ اور حقوق کا الگ۔ اب ہم اپنی زندگیوں میں دیکھیں، کیا ہم نے ان کو اصلی حسن دیا؟ جب ایک چیز ہمارے پاس موجود ہے تو اس کو چھوڑ کر مصنوعی خوشیوں کے پیچھے کیوں پڑے ہیں؟ اسی وجہ سے ہمارے احساسات اور تعلقات کمزور پڑ گئے۔ جنہیں عملی زندگی کا نام دیتے ہیں، اسی سے معاشرے میں بگاڑ اور لوگوں کی خوشیاں برباد ہو رہی ہیں۔

ان کو کیسے روکا جائے؟ سوشل میڈیا کے تمام بہن بھائیوں سے درخواست ہے کہ ان حالات سے اپنی قوم کو نکالیں۔ تبدیلی کا آغاز آپ لوگ کریں۔ عوام کو سادگی کی اہمیت سے آگاہ کرائیں کیونکہ یہ قوم آپ لوگوں کے پیچھے چلنے والی ہے۔ برانڈ مافیا جیسی مرض سے نجات دلوا کر حقیقی زندگی کا رنگ واپس لا کر شکریہ کا موقع دیں۔

ترجمہ: ''(قیامت کے روز) وہ اپنے گناہوں کے بوجھ بھی ضرور اٹھائیں گے، اور اپنے بوجھ کے ساتھ کچھ زیادہ......''

(سورۃ العنکبوت۔ آیت: 13)

19 اگست 2018ء

روئیتِ پیر

ہر لفظ کے پیچھے ایک داستان ہوتی ہے۔ ''پیر'' فارسی زبان کا لفظ ہے یعنی بزرگی والا۔ دورِ قدیم میں انسان کی معاشرت آج سے بہت مختلف تھی۔ انسان ابتدائی دور میں خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کرتا ہوا ترقی کی طرف سفر کرنے لگا۔ وقت کی ضروری تعلیم کے لیے اللہ کے منتخب بندے اس کی اصلاح کے لیے آتے رہے جن کے ذریعے اللہ اپنے بندوں کو معجزے بھی دکھاتا رہا لیکن یہ معجزے نبیؑ کی حیاتِ طیبہ تک ہی ہوتے رہے۔ چونکہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم آخرالزمان ہیں، اس لیے زندہ اور سب سے بڑا معجزہ قرآنِ پاک دیا گیا۔ یہ ہماری خوش بختی ہے کہ اللہ نے مقدس کتاب کی حفاظت کا ذمہ خود لے کر ہمیں اس کی پیروی کا حکم دیا اور قرآنِ پاک کی سچائی بھی اس طرح بیان کر دی۔

> ترجمہ۔: ''اور (اے پیغمبر) ہم نے تجھ پر سچی کتاب (قرآن پاک) اتاری وہ اگلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔ اور ان کی حفاظت کرتی ہے۔''
>
> (سورۃ المائدہ۔ آیت:48)

چونکہ قرآنِ پاک میں زندگی گزارنے کے اصول بتائے گئے ہیں اور انہیں سمجھنے کے لیے عربی زبان کا جاننا ضروری ہے لیکن علمی فقدان کے باعث ہر ایک کے لیے ممکن نہیں۔ اس نعمت سے محروم لوگ اپنے دینی و دنیاوی مسائل کے حل کے لیے کسی صاحبِ علم و فراست، حکمت و دانش باعمل زاہد بزرگ کے پاس بیٹھ کر اپنی تشنگی کیلئے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ یہاں سے پیری فقیری کا آغاز ہوا۔ یہ بزرگ لوگ اپنے قریہ کے لیے بڑے بابرکت ہوتے ہیں۔ اپنی ذات سے زیادہ دوسروں کا خیال رکھتے ہیں، ان کی اصلاح اپنا فریضہ سمجھتے ہیں اور ملنے والوں کا اس حد تک احساس کرتے ہیں کہ ان کے بتائے بغیر چہرہ شناسی سے اندازہ لگا لیتے کہ کون تنگی و مصائب کا شکار ہے۔ یعنی ایک طرح سے وہ ماہرِ نفسیات ہوتے تھے۔ پھر اپنی حیثیت کے مطابق ان کی

رہنمائی کرتے تھے۔آدھی تکلیف ان کی دل جوئی سے دور ہو جاتی تھی۔ جب آپ کو احساس ہو جائے کہ کوئی تو اپنا ہے جو آپ کے دکھ کو سمجھتا ہے تو اس سے اضطرابی شدت کم ہونے لگتی ہے۔ جب یقین ہو جائے کہ بات کسی بااعتماد شخص تک پہنچ گئی ہے تو اس کو لاشعور میں دھکیلنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اپنے مسائل زاہد بزرگ کے گوش گذار کرنے کے بعد وہ خود کو پرسکون محسوس کرتے ہیں جس سے جسمانی صحت میں بھی بہتری آتی ہے۔ یہ اللہ کے ولی اپنے دور کے ڈاکٹر، جج، ماہرِ ابلاغیات، رہنما، دینی عالم اور روحانی معالج ہوتے۔ وہ منفی پہلو سے ہمیشہ بچتے۔ ویسے تو انسان خطا کا پتلا ہے، ان سے بھی غیر ارادی طور پر خطائیں ہو جاتی ہوں گی مگر ارادی طور پر اجتناب کی کوشش کرتے۔

ان کی تعلیم سب کے لیے ایک ہوتی جس کی ابتدا یہاں سے کرتے کہ تمام مسلمان برابر ہیں، لہٰذا اپنے بھائی سے صلح و آشتی رکھو، ایک دوسرے سے لطف و مہربانی سے پیش آؤ، کسی کی دل شکنی نہ کرو۔ وہ چلتے پھرتے تعلیمی، تبلیغی اور اصلاحی ادارے ہوتے۔ نہ ان کو کسی کیمرے کی ضرورت ہوتی نہ اشتہار کا شوق، پھر بھی لوگ ان کا نام سن کر شخصیت کو پہچان جاتے۔ ہمیشہ اچھی صحبت میں رہنے کی تلقین کرتے کیونکہ اس سے انسان کی اصلاح ہوتی ہے۔ یہاں ایک واقعہ یاد آجاتا ہے کہ ایک شخص دورانِ طوافِ خانہ کعبہ دعا مانگ رہا تھا کہ ”اے اللہ میرے بھائیوں کی اصلاح فرما۔“ لوگوں نے پوچھا کہ اس مقام پر اپنے لیے دعا کیوں نہیں کر رہے؟ اس نے جواب دیا کہ ”میں چونکہ انہی کے ساتھ واپس جاؤں گا، اگر وہ درست رہے تو میں بھی درست رہوں گا اور اگر وہ خراب راستے پر چل نکلے پھر میں بھی ان کے ساتھ خراب ہو جاؤں گا۔ اپنی درستی مصلحین کی درستی پر موقوف ہے۔ اس لیے میں اپنے بھائیوں کے لیے دعا کرتا ہوں تا کہ میرا مقصود ان سے حاصل ہو۔“ اصل میں وہ جان گیا تھا کہ نفس کی عادت ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں سے راحت پاتا ہے۔ جن کی صحبت اختیار کی جائے، ان کی خصلت اپنا لیتا ہے۔ اسی وجہ سے تمام مشائخ سب سے پہلے صحبت کے حقوق کے نہ صرف خواہاں رہتے ہیں بلکہ مریدوں کو بھی اس کی ترغیب دیتے۔ کینہ، بغض، حسد، عداوت اور دشمنی سے اجتناب کی نصیحت میں کوتاہی نہ کرتے۔ وہ اپنے وقت کے ادیب، مفکر، دانشور اور حکیم سمجھے جاتے۔ ہر وقت انہیں مخلوقِ خدا کی فکر رہتی۔ یہ تھیں ابتدائی دور کے پیر کی خصوصیات جن کی وجہ سے مریدان کی حکم عدولی کو گناہ سمجھتے تھے بلکہ ایسے کام شوق

سے کرتے جن میں اللہ، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے پیر کی خوشی شامل ہوتی تاکہ اللہ کے ولی کی دعا دل سے نکلے۔ حق و باطل میں فرق بتانے والے یہی لوگ ہوتے۔ ان کی طریقت پر چلنا باعثِ فخر سمجھتے۔ برصغیر میں انہی کی وجہ سے اسلام پھیلا۔ اس لیے انہیں بڑی عقیدت کی نظر سے دیکھا جاتا۔ ان کے مرید اس حد تک عاشق ہوتے کہ اپنے ہر مسئلے کا حل پیر سے پوچھتے لیکن جب عقیدت حد سے بڑھ جائے تو مسئلہ بن جاتا ہے۔

ضروری نہیں کہ ان کی اولادیں بھی ان کی تقلید کریں۔ حضرت نوحؑ کے گھر میں کنعان پیدا ہوسکتا ہے تو پیر کے گھر میں کیوں نہیں۔ بس یہاں مریدوں سے غلطی ہوگئی۔ انہوں نے پیر کے بیٹے کو پیر کا وارث سمجھ لیا۔ کسی بزرگ کی اس دنیا فانی سے پردہ پوشی کے بعد اس کی اولادوں میں سے کسی کو اس کے برابر درجہ دیا جانے لگا۔ وہ جیسے بھی ہوتے، ان کو سجادہ نشینی کا تاج پہنا کر پیری سکھائی جانے لگی۔ اب ضروری نہیں کہ اس کی فطرت اپنے جدِ امجد جیسی ہو۔ اس وجہ سے مثبت کردار کا زوال شروع ہونے لگا۔ ان کی تعلیمات کو بھلا کر مزارات پر دربار بننے لگے، میلے ٹھیلے منعقد ہونے لگے۔ جہاں کہیں ان کی تصنیف میں لچک دیکھی، اسے بنیاد بنا کر دوسروں سے الگ فرقہ بنالیا اور اپنا کاروبار شروع کرلیا۔ جن کاموں سے منع فرماتے، وہ سب کچھ ہونے لگا۔ اس کو عقیدے کا نام دیا گیا۔ ان کی تصانیف کو نظرانداز کر کے نام سے فائدہ اٹھایا جانے لگا یہاں تک کہ اب پیری کا مطلب ہی بدل کے رہ گیا ہے۔

آج پیر کب اور کہاں نظر آتا ہے؟ جب الیکشن کا دَور ہو۔ سننے میں آتا ہے کہ پیر صاحب ووٹ مانگنے آئیں گے اور عقیدت منداس ڈر سے ان کا حکم نہیں ٹالتے کہ کہیں بددعا نہ دے دیں۔ آج کل کے پیر پر اگر لکھا جائے تو ایک ہی کتاب کی کئی جلدیں بنیں، اس لیے یہ کہانی پھر سہی۔ ہماری قوم ذہنی طور پر پیر کی عادی ہوچکی تھی لیکن پیر کے پاس اسلام سکھانے کے لیے تبلیغ کے لیے یا علم نہیں، یا فرصت نہیں اور مرید کسی اور کی تعلیم پر عمل نہیں کرتے۔ اس وجہ سے ذہنی الجھنوں کا شکار ہوکر بے راہ روی کا شکار ہورہے ہیں۔ ماہرِ نفسیات کے پاس جانے کو یہ لوگ تیار نہیں۔ ہمارے معاشرے میں اس کردار کی اشد ضرورت ہے۔ ہمیں کوئی متبادل رستہ اختیار کرنا ہے۔ اس کے سوا پستی سے نکلنے کا کوئی رستہ نظر نہیں آتا۔ اب پیری سے لوگ اس حد تک بے زار ہو چکے ہیں کہ اس کی تعمیرِ نو بھی ممکن نہیں۔ اس لیے ہمیں ایک نئے کردار کو متعارف کروانے کی

ضرورت ہے۔ وہ کونسل اور کونسلی ہے۔ یہی اس کی جگہ لے سکتا ہے کیونکہ پیر اور مرید کا رشتہ اصل میں یہی رشتہ تھا۔ پیر مریدوں کی کونسلنگ کرتے تھے اور ان کو زمانے کی تلخیوں سے بچنے اور سامانِ آخرت جمع کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ ان کے بعد اس سائے کو بڑی شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے۔ ایک ہمدرد کی تلاش ہے۔ محمد حمزہ حامیؔ نے بڑی خوبصورتی سے تصویر کشی کی ہے

وہ بوڑھا شجر گھر کا جب سے گرا ہے
کڑی دھوپ ہے، سائے انجان ہیں اب
مری خشک آنکھوں کے صحرا میں جھانکو
کہ اندر سے یہ کتنی ویران ہیں اب

بزرگ کی مثال بھی ایک شجر کی سی ہوتی ہے جس کا سایہ کسی رحمت سے کم نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ سب کو نصیب کرے۔

آمین، ثم آمین۔

19 دسمبر 2018ء

پیشہ ور بھکاری

نمازِ فجر کے بعد ہر طرف خاموشی کا راج ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کے لیے یہ خالص ذکر واذکار کا وقت اور کچھ کے لیے میٹھی نیند سونے کا۔ جنہیں رات بھر نیند نہیں آتی، وہ بھی خوابِ غفلت میں ہوتے ہیں۔ اس بابرکت گھڑی میں فرشتے برکات لے کر زمین پر اترتے ہیں۔ ان کی خبر کم ہی لوگوں کو ملتی ہے۔ البتہ کبھی کبھی چند مخصوص آوازیں جب اس سناٹے سے ٹکرائیں، وہ پرسکون فضا کو آلودہ کرنے سے کم نہیں ہوتیں۔ اس پر حیرت اس بات کی کہ صدا لگانے والے اپنے گھر سے کب نکلتے ہوں گے جو علی الصباح یہاں پہنچ جاتے ہیں۔ حسبِ توفیق ان کی مدد کرنے کے لیے دروازہ کھولا تو ایک تجسس سا ہوا۔ یہ ماسی تقریباً پچھلے اٹھارہ بیس سال سے اس ہاتھ والی ریڑھی میں بچے کو لیے پھرتی ہے۔ نہ کبھی حرکت کی نہ کبھی بولا۔ اتنے عرصے میں اس کو جسمانی طور پر بڑا ہو ہی جانا تھا۔ فطرتِ انسانی کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے بچے کے متعلق پوچھا۔ اس نے ذہنی معذوری کی کہانی گھڑ کے سنائی۔ سن کر ایسے لگا کہ انڈیا کے کسی چینل کے ڈرامے کی کہانی ہے۔ نہ سر، نہ پاؤں، نہ سیاق و سباق...... اس بے ربط داستان کو نہ عقل ماننے کو تیار نہ دل...... پھر میرے اصرار پر نقاب کشائی کی رسم ہوئی۔ پردہ اٹھایا گیا۔ چھ یا سات سال کے بچے کو نیم بے ہوشی میں دیکھ کر پاؤں کے نیچے سے زمین سرک گئی۔ اتنا چھوٹا بچہ اس عمر رسیدہ کا! اس کے بعد اپنا معمول بن گیا۔ جہاں ریڑھی دیکھی، وہیں پوچھ گچھ شروع اور تب مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ کچھ عرصہ بعد سوار بدل جاتا ہے۔ یہ سوچ کر میں نے خود پر سوالوں کی ایک بوچھاڑ کر دی۔ اتنے بچے کہاں سے آتے ہیں؟ اگر اپنے ہوتے ہیں تو انہیں بے ہوش کیوں رکھا جاتا ہے؟ جو بچے لاپتہ ہو جاتے ہیں، وہ کہاں جاتے ہیں؟ ان سب کی ریڑھی، یکساں آواز، ایک سا لہجہ اور بستی بھی سب کی مشترکہ، اس طرف کبھی کسی نے توجہ نہیں کی۔ یہ کس کے لختِ جگر ہوں گے؟ انکے والدین کا کیا حال ہوتا ہوگا؟

یہ بھی اسی معاشرے کا حصہ ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو تمام جسمانی اعضا دیے مگر محنت کرنے کے

بجائے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانا انہیں آسان لگتا ہے۔ ویسے ہماری پوری قوم اپنی روزی روٹی کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے کے بجائے دوسروں کی روزی پر ہاتھ مارنا زیادہ پسند کرتی ہے۔ محنت و مشقت سے جی چرانے والوں کی عزت و آبرو کی عمارت منہدم ہو کر کھنڈرات کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ غلاظت زدہ وجود اور لباس ان کی ضرورت بن کر آہستہ آہستہ گندگی کو ذہن میں اتارنا شروع کر دیتا ہے جہاں وہ اپنا گھر بنا لیتی ہے۔ پھر یہی لوگ معاشرتی اور تہذیبی زندگی کا دیوالیہ نکالنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ دنیاوی مال و متاع کس لیے؟ سکون و آرام کے لیے یا اپنی اولاد کی اچھی تعلیم و تربیت کے لیے...... لیکن یہاں معاملہ ہی عجب ہے۔ بھکاری کی اولاد بھی بھکاری ہوتی ہے۔ کیا یہ صرف شکم سیری کے لیے سب کچھ کرتے ہیں؟ ان کا مقصدِ حیات کیا ہے؟

اس میں نقصان کس کا ہے؟...... پوری انسانیت کا...... اول تو ان لوگوں کو مذہب میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی، لیکن پھر بھی کوئی مذہب تو ہوتا ہوگا، کیا ان کے مذہبی رہنماؤں کو یہ نظر نہیں آتے؟ انہیں طرزِ معاشرت اور صراطِ مستقیم کی تعلیم کون دے گا؟ اگر روزِ آخرت انہوں نے یہ کہہ دیا کہ ہمیں کسی نے دین سکھایا ہی نہیں تو ان کے ہم عصر علمائے کرام کا کیا بنے گا؟ کیا انہوں نے اپنے نبی ﷺ کی تعلیم کے وارث ہونے کا صحیح فرض ادا کیا؟ کیا ان کو ارشادِ باری تعالیٰ کی تعلیم دی؟ کیا جواب دیں گے کہ ہمیں دنیا کی کرسی کے لالچ نے اتنی فرصت نہیں دی، دین سکھانے کی یا یہ آئین کے تناظر میں نہیں تھا۔ کاش! ہر کام آئین کے مطابق کرنے والوں کو یہ بھی یاد رہتا۔ کیا یہ خدمتِ خلق نہیں؟ صرف چندہ مانگنا آتا ہے۔ تعلیم و تربیت کون کرے گا؟ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ''اے لوگو تم اللہ تعالیٰ کے محتاج ہو اور اللہ تعالیٰ ہی بے پرواہ ہے۔ خوبیوں والا ہے۔'' (سورۃ فاطر۔ آیت: 15)

یہ چھوٹا مسئلہ نہیں، اس سے نہ صرف اپنی زندگی اور آخرت برباد کرتے ہیں بلکہ پورا معاشرہ ان کی نازیبا حرکات کی وجہ سے متاثر ہوتا ہے۔ سڑکوں اور چوکوں پر ہی پڑاؤ ڈال لیتے ہیں جس سے آمد و رفت کا نظام متاثر اور حادثات کا سبب بنتا ہے۔ جب تک گاڑی چوک میں رکی رہے، یہ جان نہیں چھوڑتے۔ اگر گاڑی کا شیشہ کھلا ہو تو واردات کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ اسی طرح رہائشی آبادیوں میں گشت کرنے والے انہی اصولوں کی تقلید کرتے ہیں۔

مختلف شہروں میں اس طرح کے کئی واقعات ہو چکے ہیں۔ جن لوگوں کو ذہنی طور پر بھیک کی

لت پڑ جائے، پھران کے دماغ میں خلل واقع ہوتے رہتے ہیں اور پیسہ جمع کرنے کی دھن سوار ہو جاتی ہے۔سید منظر آعباس شاہ کیا خوب کہتے ہیں۔

ہر کوئی ایسے اسے پوج رہا ہوتا ہے
جیسے پیسہ ہی زمانے میں خدا ہوتا ہے

یہ خانہ بدوش جہاں کچھ عرصہ پڑاوٗ ڈالتے ہیں، وہاں کچھ مخلوقِ خدا کی پیدائش معمول سے بڑھ جاتی ہے۔جیسے مکھی، مچھر اور کیڑے مکوڑے وغیرہ۔وقتِ سفر اپنی بساط واوقات کے مطابق اس آبادی کو اپنا ہم سفر بنانے میں کوئی عار نہیں سمجھتے اور وہ بھی وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے آمادہ سفر ہو جاتی ہے۔باقی آس پاس کے شہروں بستیوں کا رخ کر کے بن بلائے مہمان کا کردار ادا کرتی ہے۔یہ صرف حشرات نہیں بلکہ جراثیم کی وہ چلتی پھرتی نرسری ہے جو ہر اس جگہ پہنچ جاتی ہے جہاں یہ بھکاری قدم رنجہ فرمائیں۔اس طرح وبائی امراض کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کرنے کا فریضہ انجام دے کر اپنے ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔وہ خود کن کن بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں، اس بات سے شاید کسی کو کوئی فرق نہ پڑے مگر یہ بات جان کر ضرور فکر لاحق ہوگی کہ آس پاس کے لوگ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

افسوس ہے کہ اسپتالوں میں بھی ان کا جمِ غفیر ہوتا ہے۔جہاں مریض کمزور اور قوتِ مدافعت کم ہونے کی وجہ سے جراثیموں کے حملے کا مقابلہ نہیں کر پاتے۔وہ جن امراض کے علاج کیلئے صحت کے مراکز میں جاتے ہیں، اگر ان کا علاج ہو بھی جائے تو واپسی پر درجنوں بیماریاں لے کر لوٹتے ہیں۔اس لیے حفظانِ صحت کا خیال رکھتے ہوئے ایسی جگہ پر سختی سے ان لوگوں کا داخلہ ممنوع کیا جائے۔ان کو روکنا کسی ایک انسان کے بس کی بات نہیں بلکہ پوری انسانیت پر فرض ہے۔جتنا عام شہری پر، اتنا ہی علمائے کرام، حکومتِ وقت اور قانون نافذ کرنے والے اداروں پر۔لیکن سب سے زیادہ قانون کو حرکت میں آنے کی ضرورت ہے۔

غریب ہونا جرم نہیں لیکن غربت کی بنا پر مجرم کو آزادی دینا بے وقوفی ہے۔اس استثنیٰ کی وجہ سے ان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔وہ محنت اور قانون دونوں سے نہ صرف بچ جاتے ہیں بلکہ اپنا پورا بوجھ دوسروں کے کندھوں پر ڈال کر خود بے فکری اور غفلت کی میٹھی نیند سوتے ہیں۔

8 اکتوبر 2018ء

تبدیلی کیسے آئے گی؟

تیز ہوا میں سڑک کے کنارے درختوں کے پتوں نے ایک خوبصورت دھن میں سریلی آواز میں گنگنانا شروع کیا، ''تبدیلی آ نہیں رہی آ چکی ہے۔'' کسان کے مرغ نے اس کی توجہ ان رنگینیوں سے ہٹا کر اپنی طرف کر لی جب وہ ایک بلی کے پیچھے بھاگا اور اسے دور چھوڑ آیا۔ اپنے مالک کو حیرانی میں دیکھ کر اس کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی مخصوص آواز میں ایسے ہم کلام ہوا، ''تبدیلی آ نہیں رہی، تبدیلی آ چکی ہے''......اس تبدیلی کی نہ صرف انسانوں نے بلکہ شجر کے پتوں سے لے کر شبنم کے قطروں تک، گلشن کے گلوں سے لے کر گھاس کے تنکوں تک، زمین پر چلنے والے کیڑوں سے لے کر فضا کی بلندی پر اڑنے والے پرندوں تک، بلوں میں رہنے والی مخلوق سے لے کر جنگل کے درندوں تک سبھی نے اس تحریک میں حصہ لیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ہر ایک کی سماعتوں تک اس نعرے کو پہنچا دیا۔ کچھ نے بات سنی، کچھ نے سنی ان سنی کر دی، اب دیکھنا یہ ہے کہ عملی زندگی میں اس کا اطلاق کس حد تک ہوا ہے؟ پہلے دودھ میں پانی کی ملاوٹ ہوتی تھی، اب پانی میں دودھ کی ملاوٹ...... پہلے گوشت کم تولا جاتا تھا، اب اس میں پانی ملا دیا جاتا ہے...... بھکاری دروازے پر صدا لگانے کی بجائے گھنٹی بجا کر ایک پرچہ ہاتھ میں تھما دیتے ہیں...... پہلے لوگ اپنی گلی سے صفائی شروع کرتے، اب گھر کا کوڑا کچرا اٹھا کر گلی میں پھینکتے ہیں...... پہلے فون سننے کیلئے لوگ گھر جاتے، اب باہر نکل کر سننا پڑتا ہے...... یہ تبدیلی گھر کے اندر بیٹھ کر محسوس کی جانے والی ہے۔ اب باہر کی دنیا کا کیا حال ہے۔ فٹ پاتھ پر ویسی کی ویسی تاجروں کے سامان کی نمائش، پارکنگ کی جگہ پھل فروشوں کا قبضہ قائم و دائم، ڈرائیونگ کے دوران کال سننے کا سلسلہ جاری، ون وے روڈ پر تو وہی ٹریفک کا وہی حال، طوطے والے کے پاس قسمت کا حال جاننے والوں کا پہلے جیسا جمِ غفیر، یہ سب دیکھ کر ذہن میں ایک سوال ابھرا کہ کیا اس تبدیلی کے نعرے کا انسانی زندگی پر کوئی مثبت اثر نہیں ہوا؟

ان منفی عادات میں مثبت تبدیلی لانے کے لیے پرانی اور فرسودہ سوچ کی نقل مکانی کے بغیر کچھ ممکن نہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ اس پختہ کلچر کا ایک دم ریٹائر ہوجانا بالکل ایسے ہی ہے جیسے بچپن کے بعد بڑھاپا جو کہ کم ہی ہوتا ہے۔ شروع شروع میں عروج سے انحطاط کی طرف سفر کا آغاز ہوتا ہے پھر جا کر زوال کی باری آتی ہے۔ یہی حال سوچ کا ہے۔ وہ بھی آہستہ آہستہ بدلے گی۔ کچھ لوگ جارحانہ رویے اختیار کرتے ہیں اور کچھ اللہ والے یہ سوچ کر خاموش رہتے ہیں۔ شاعر اس کو یوں بیان کرتا ہے۔

سزا پہ چھوڑ دیا اور جزا پہ چھوڑ دیا
ہر ایک کام کو ہم نے خدا پہ چھوڑ دیا

لیکن ایک تیسرا گروہ کام کی ابتدا خود کرتا ہے اور دوسرے اس کی تقلید کرتے ہیں۔ اصل تبدیلی لانے والے یہی لوگ ہیں۔ اس طرح اپنی غلط عادات کو کالعدم قرار دے کر ان سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے بلند ہمتی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تب ممکن ہے جب پرانی عادات اور نئی سوچ آپس میں صف آرا ہو کر فیصلہ کریں۔ پھر فتح جس کا مقدر بنے گی اور اسی کا راج ہوگا کیونکہ نقل کے پجاری عقل کو استعمال کرنے میں دِقت محسوس کرتے ہیں۔

ان کی ایک چھوٹی سی مثال پیشِ خدمت ہے۔ موبائل فون پر چھ روپے میں دو گھنٹے کا پیکج حاصل کرنے والے جب تک پورے دو گھنٹے بات نہیں کر لیتے، ان کو لگتا ہے کہ ان کے پیسے ضائع ہو گئے ہیں۔ اگر پورا ٹائم ان کی کال چلتی رہے تو سکون آجاتا ہے کہ پیسے پورے ہو گئے ہیں۔ اب چھ روپے کے چکر میں وہ کتنا قیمتی وقت ضائع کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے، اور ایسے لوگوں کی گفتگو کیسی ہوتی ہے۔ اچھا آج کیا کھایا ہم نے یہ پکایا ہے۔ آپ نے کیا پکایا جو انسان کی قسمت میں لکھا، اس نے کھا لیا، ایسی باتیں کس زمرے میں آتی ہیں۔ فضول الکلامی ایک تو دوسرے کے وقت کا خسارہ ہے، دوسرا کسی کی ذاتی زندگی میں مداخلت ہے، تیسرا دوسروں کے گھریلو حالات سے آگاہی جو میرے خیال میں کسی کو اپنے گھر کے حالات سے اور ذاتی زندگی کے متعلق جتنا بتایا جائے گا، وہ اگر کل کو بلیک میل کرنے پر اتر آئے تو اپنے لیے مشکل......

مولا علی حیدر کرارؓ کا قول ہے کہ جو جتنا اچھا دوست ہوتا ہے، دشمن بنتا ہے تو اتنا ہی برا دشمن بنتا ہے۔ بھروسہ جب ٹوٹتا ہے تو انسان کو اندر سے توڑ دیتا ہے۔ شاعر کہتا ہے:

ملا جو رنج مجھے وہ بھی انتہا کا تھا
کہ مجھ کو اس پہ بھروسا بھی تو بلا کا تھا

زندگی کا ایک ایک پل قیمتی ہے۔ اس کی قدر کرنی چاہئے۔ فضول الکلامی اور فضول الطعامی میں ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ یہاں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ہر وقت کھانے کی فکر کرنے والے کی سوچ کا دارومدار اس کے معدے کے ساتھ منسلک ہو جاتا ہے۔ جیسے ہی معدہ خالی ہوا، دماغ نے کام کرنے سے انکار کر دیا...... اور جب کسی کو ملنے جائیں تو ایک کپ چائے کی خاطر گھنٹہ انتظار کرنا پڑتا ہے۔ پھر خوشی محسوس کرتے ہوئے کہ ہماری بڑی خاطر تواضع ہوئی، مگر چائے کے بدلے کتنا قیمتی وقت دیا، اس کا حساب نہیں کرتے۔ ورنہ یہ گھاٹے کا سودا کیوں کرتے؟ یہاں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ بیس روپے کی چیز خریدتے وقت پندرہ روپے دیتے ہیں۔ باقی کے پانچ کے لیے بحث و مباحثہ کے بعد فیصلہ ہوتا ہے۔ جس کے دلائل مضبوط ہوں، وہ بازی لے جاتا ہے لیکن جہاں معاملہ لاکھوں کروڑوں کا ہو، وہاں خاموشی کے ساتھ ادا کر دیتے ہیں۔ کبھی جوتوں کی دکانوں پر غور کریں۔ اے۔ سی ہال اور ہوا بند شیشوں والی دکان، جیسے یہاں جوتے نہیں دمے کے مریض ہوں کہ ذرا سی گرد پڑے گی اور ان کی بیماری میں اضافہ ہو جائے گا۔

اب آئیں اشیائے خورونوش کی طرف ...... کھلے عام فروخت ہونے والے سموسے، پکوڑے، کباب، ملک شیک اور تازہ جوس بنانے والوں کے پاس مکھیوں کا لشکرِ جرار، فضا میں اڑتا گردوغبار، گاڑیوں کا دھواں...... یہاں سوچ بدلنے کی ضرورت ہے۔

کچی بستیوں کو مسمار کر کے ان کی جگہ غیر قانونی محلات تعمیر کرنے والوں کے لیے غریب کا ایک وقت کے کھانے کے بدلے ان کے حق میں نعرے لگانا...... یہاں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اس کی ضرورت ہر ایک میدان میں ہے لیکن اس کا کلیہ سب کے لیے الگ ہے کیونکہ جو جس فیلڈ میں ہے، اس کو اسی کے مطابق عمل کرنا پڑے گا۔ اللہ کے قانون کو چھوڑنے والوں کے لیے واپس پلٹنے کی ضرورت ہے۔ پہلی اقوام اور ہم میں کیا فرق ہے کہ انہوں نے اللہ کے کلام کو بدل ڈالا اور ہم نے اپنے اعمال کو، اس طرح دونوں ہی راستے سے بھٹک گئے۔ جنہوں نے اللہ کے کلام کو بدلا، ان کے لیے ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

ترجمہ: ''پس بدل ڈالا ان لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا تھا بات کو سوائے اس

کے جو کہی گئی تھی واسطے ان کے پس اتارا ہم نے اوپر ان لوگوں کے کہ ظلم کرتے تھے عذاب آسمان سے بہ سبب اس کے کہ تھے فسق کرتے۔"

(البقرہ۔آیت، 59)

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی بری عادات کو نیکی میں بدلنے کی توفیق دے اور اس تبدیلی میں ہماری مدد فرمائے۔آمین۔

28 اگست 2018ء

لاعلمی

خالقِ کائنات نے کچھ چیزیں انسانی فطرت اور سرشت میں شامل کر کے اسے دنیا میں بھیجا۔ اچھی فطرت پر قیام اور بری سرِشت سے گریز کے اصول کو مقصدِ حیات میں شامل کر کے اس کی پابندی لازمی قرار دے دی۔ اگر صرف بھلائی ہی خمیر میں شامل ہوتی تو یہ جہاں امتحان کی جگہ نہ رہتا۔ اصل آزمائش یہی ہے۔ صراطِ مستقیم پر چلنا، مشکل لگے یا آسان لگے، ہر حال میں اپنے مالک کو منانا ہے۔ اگر برائی طبیعت میں شامل نہ ہوتی تو یہ کام بہت آسان ہوتا۔ جتنی بڑی مشکل سامنے آئے گی، اتنی ہی برداشت بڑھے گی، اللہ کی خوشنودی کی خاطر برداشت ہی راہِ نجات کی طرف لے جائے گی۔ اس حقیقت کے عیاں ہونے پر بندہ ہر اس عمل سے گریز کرے گا جس کے کرنے سے روزِ حشر اپنے مالک کے سامنے شرمسار ہونا پڑے۔ خواہشِ نفس سے بے نیاز ہو کر، اپنا ایک ایک پل قیمتی سمجھ کر حالات کی لہروں سے لڑتا ہوا، فرائض کی ادائیگی میں مشغول رہ کر بھی ہر لمحہ موت کو اپنے سر پر یوں سوار دیکھتا ہے کہ اگلی سانس پر واقع ہونے والی ہے۔ آرزوؤں کی زنجیروں میں جکڑے انسان کو جب موت کا یقین ہو جائے تو فطرت تقاضائے ہدایت کرتی ہے۔ اس طرح وہ تمام تر برائیوں کا قلع قمع کرتا ہوا طالبِ حق بن جاتا ہے جس کے بعد اس کے سامنے سے تمام حجاب اٹھا دیے جاتے ہیں تا کہ وہ اپنی عقل سے کام لے کر منزل کو پہنچے جو مالکِ کونین نے اپنے محبوب سرورِ دو جہاں محمد مصطفیٰ ﷺ کے ذریعے ہمیں بتائی۔ جب کوئی حکمِ الٰہی اور اتباعِ رسول ﷺ کا ارادہ کرے، اسے غلط اور صحیح میں امتیاز نظر آنے لگتا ہے ورنہ ہر مذہبی کام کرنے والا اس کو نیکی ہی سمجھتا ہے چاہے وہ بغیر سیکھے کرنے کی کوشش میں الٹا کر بیٹھے۔ اس کی عقل پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ اس کی مثالیں ہمارے معاشرے میں عام ملتی ہیں۔ جیسا کہ ہم نے مذہب اور رسم کے درمیان فرق کو ختم کر دیا اور مذہبی عقائد کو رسومات بنا کر اپنی مرضی کے مطابق تراش خراش کر کے کچھ نوافل کو فرائض سے آگے کر دیا۔ اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ

فرض کی جگہ نفل لے لیتے ہیں۔ جب ان کو سمجھانے کی کوشش کی جائے تو مغز پھرے پوچھتے ہیں کہ ہم جو کر رہے ہیں، کیا یہ گناہ ہے؟...... بس اتنا بتا دیں کہ اب وہ گناہ بھی نہیں ہوتا لیکن اس سے فرض کی ادائیگی میں فرق آتا ہے مثلاً ایک انسان کو اپنی نیند کا علم ہے کہ وہ چار یا چھ گھنٹے سے کم میں پوری نہیں ہوسکتی اور وہ رات دیر تک نفلی عبادت میں مشغول رہنے کی وجہ سے دیر سے سوتا ہے۔ نتیجتاً نمازِ فجر رہ گئی۔

ایسے مسلمانوں کو اگر کہا جائے کہ آپ کو جلدی سونا چاہئے تھا تاکہ نماز میں کوتاہی نہ ہوتی تو اپنی لاعلمی کی وجہ سے کہتے ہیں کہ اتنی بابرکت رات تھی، زندگی میں دوبارہ آنی بھی ہے یا نہیں، ساری رات نوافل ادا کیے، اگر نماز رہ گئی تو کیا، اللہ تعالیٰ کو علم نہیں کہ کیوں رہ گئی؟ اس نے نماز فرض کی ہے، جس کے لیے ہم جواب دہ ہوں گے۔ وہ ہر حال میں پوچھا جائے گا۔ نوافل ادا کریں یا نہ کریں، فرض کا حساب لازمی دینا پڑے گا۔ اسی طرح ایک بہن کے ساتھ کھڑے ہو کر نمازِ عصر ادا کرنے کا اتفاق ہوا، محترمہ نے نمازِ سنت کھڑے ہو کر ادا کیں اور فرض بیٹھ کر۔ میرے پوچھنے پر بتایا کہ جوڑں کی تکلیف کی وجہ سے پوری نماز کھڑے ہو کر ادا نہیں کر سکتی۔ میں نے کہا آپ سنت بیٹھ کر پڑھ لیا کریں اور فرض کھڑے ہو کر۔ اس کی سمجھ میں وجہ نہیں آسکی اور آگے سے کہا کہ آپ کسی اور فرقہ کی ہوں گی۔ فرض بھی اسی کے لیے پڑھنے اور سنت بھی۔ میرے خیال میں اس کا بھی اس میں قصور نہیں کیونکہ اسے یہ باتیں سکھائی ہی نہیں گئیں کہ فرض، واجب، سنت اور نفل کے درمیان کیا فرق ہے؟ اس کا حساب کون دے گا؟ کیا علماء کرام سے نہیں پوچھا جائے گا کہ میں نے تمہیں علم دیا تا کہ اسلام کی حفاظت کر سکو جبکہ تم جان جوکھوں میں ڈال کر جمہوریت کو بچانے میں لگے رہے اور ایوان میں جا کر کون سے تیر چلا لیے، اس کی زیادہ فکر تھی۔ کاش! کوئی ان سے پوچھے:

پیغامِ نبیؐ پہنچایا ہے ؟
قرآن کبھی سمجھایا ہے ؟
اسلام ہے کیا مطلب اس کا
اس قوم کو کیا بتلایا ہے ؟

یہ صرف ایک مثال تھی ورنہ ہمارا معاشرہ اسی طرح کے خود ساختہ مذہبی عقائد کی گرفت میں آچکا ہے جس سے آزادی حاصل کیے بغیر ہم تعلیمی بحران سے تو نکل سکتے ہیں مگر جہالت کو ختم نہیں کر

سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے کچھ کاموں کے لیے حدود مقرر کر دی ہیں لیکن ہم ان میں بھی ثواب کی غرض سے اضافہ کر لیتے ہیں اور کچھ نہیں ہو سکا تو عیدوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا۔ آپ ﷺ ہر پیر کا روزہ اپنی ولادت کی خوشی میں رکھتے تھے لیکن ہم نے ربیع الاول کو رسم بنا لیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے چندہ مانگنے آ جاتے ہیں کہ گلی کو سجانا ہے۔ یہ دن گلی کو نہیں، اپنے من کو سجانے کا ہونا چاہئے لیکن ہمارے دل ہی صاف نہیں ہو پاتے کیونکہ ہم نیت کو سیدھا رکھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ اپنے آپ کو ایسا بنائیں گے جیسا ہمارے رب کا حکم اور ہمارے نبی ﷺ کی تعلیم بتاتی ہے۔ ان بچوں سے جب پوچھا کہ وضو کا طریقہ آتا ہے؟ جواب ملا نہیں۔ کیا یہ ہیں عاشقِ رسول ﷺ؟ یہ جو ایک دن میلاد منا کر اپنا فرض پورا کر لیتے ہیں۔ اس ہستی کے لیے جس پر اللہ اور اللہ کے فرشتے ہر وقت سلامتی بھیجتے ہیں۔ دوسرے دن یہی نعلین مبارک اور جھنڈیاں جن پر آقائے دو جہاں ﷺ کا نام اور کلمہ طیبہ لکھا ہوتا ہے، زمین بوس ہو جاتی ہیں۔ اس بے ادبی کا کفارہ کون ادا کرے گا؟ کیا یہ گناہ ہے یا ثواب؟ کم از کم اتنی تعلیم دینی چاہئے کہ ان کلمات کی کتنی عزت ہے۔ اگر اس کا علم ہوتا تو نعت شریف پڑھنے والوں پر جب پیسوں کی بارش کی جاتی ہے، نوٹوں پر گورنر کا نام بھی ہوتا ہے، ان میں کسی کا محمد بھی ہو سکتا ہے، احمد بھی، مصطفیٰ بھی، یہ سب نام کس کے ہیں؟ کیا اسلام اس کی اجازت دیتا ہے؟ کبھی کسی نعت خواں نے منع کیا؟ نہیں، کیونکہ وہ خود اس چیز سے بے خبر ہوتے ہیں۔ شہرت کا نشہ اتنا چڑھا ہوتا ہے کہ ان باتوں کی طرف کبھی دھیان ہی نہیں گیا۔ لوگوں کو اس طرح شعلہ بیانیوں سے ذہنی یرغمال بنا رکھا ہوتا ہے کہ منفی پہلو پر کبھی نظر ہی نہیں گئی اور یہ جذبات شاعر کے ہوتے ہیں، جو لکھتا ہے، نعت خواں کے نہیں۔ اس نے تو صرف روٹی کا ذریعہ بنایا ہے۔

صحابہ کرامؓ سے بڑا کوئی عاشقِ رسول ﷺ ہو سکتا ہے؟ حضرت علی حیدر کرارؓ نے ایک بار فرمایا کہ میں ہر وقت عبادت کی حالت میں ہوتا ہوں۔ صحابہؓ نے پوچھا کہ آپ دنیا کے کام بھی کرتے ہیں، اس وقت کیسے عبادت میں ہوتے ہیں؟ آپؓ نے فرمایا کہ میں ہر کام سنتِ نبویؐ کے مطابق کرتا ہوں، سنتِ رسولؐ پر عمل بھی عبادت ہے۔ ایسے ہیں عاشقانِ رسولؐ کی زندگیوں کے واقعات۔ اب ہر بندہ اپنے آپ کو عاشق سمجھتا ہے۔ ان میں سے دودھ پینے والے مجنوں زیادہ ہیں، جہاں قربان ہو دل وہاں قیمتِ سر کیا، کچھ سر کٹانے پر تیار ہوتے ہیں لیکن قرآن وسنت کے مطابق زندگی گزارنا ان کو بھی مشکل کام لگتا ہے۔ کیا یہ عشق ہے؟ قرآنِ مجید فرقانِ حمید

میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسی طرح ارشاد فرمایا:

ترجمہ: ''اور جو کوئی کہا مانے رسول کا پس تحقیق کہا مانا اللہ کا اور جو کوئی پھر جاوے پس نہیں بھیجا ہم نے تجھ کو اوپر ان کے نگہبان۔''

(سورۃ النساء۔آیت:80)

رسولؐ کی اطاعت در حقیقت اللہ کی اطاعت ہے کیونکہ نبی صرف حکم پہنچانے والے ہیں، حکم دینے والا اللہ ہے۔ اگر کوئی نبیؐ کی اطاعت نہیں کرتا تو اس کے لیے وہ خود ہی جوابدہ ہوگا کیونکہ حساب فہمی اللہ کا کام ہے۔ اس کے لیے نبیؐ کو نگران نہیں بنایا گیا۔ ہمارے ہاں ایک غلط نظریہ یہ بھی پایا جاتا ہے کہ ہر کلمہ گو کو ہمارے نبیؐ بچا لیں گے۔ جس کو یہ بھی علم نہیں کہ کلمہ کا مطلب کیا ہے؟ اگر کوئی جانتا ہے، وہ شرک نہیں کرے گا اور کلمہ کے دوسرے حصہ کے مطابق آپؐ کو اللہ کا آخری نبی مان کر اطاعت کرے گا۔ ہاں ایسے کلمہ گو کی ضرور شفاعت کریں گے لیکن جن کو پتہ ہی نہیں کہ شرک کیا ہے اور اطاعتِ نبی ﷺ کیا ہے، زندگی میں کوئی اچھا کام کبھی کیا ہی نہیں، قرآن وسنت کا علم ہے یا نہیں، انہیں بھی یہ یقین دلانا کہ فکر نہ کریں، آپ کو بچا لیا جائے گا، یہ کھلی گمراہی ہے۔ وہ بھی اسی امید پر ہیں جبکہ قرآنِ پاک کے مطابق تو وہ خسارے میں ہیں۔ میرے خیال میں خود کو مٹا کر اللہ کو پایا جاتا ہے...... یعنی ''میں'' کو مار کر۔

واللہ اعلم۔

18 نومبر 2018ء

مقاصدِ تعلیم

خالقِ کائنات ربِ ذوالجلال نے تمام مخلوقات کو اندھیروں میں پیدا کر کے انسان کو دنیا کے اسرار و رموز علم کی روشنی کے ذریعے سکھائے تاکہ وہ اپنے مالک کو پہچان کر اس کی توحید میں ڈوب جائے لیکن جسم و روح کے ملاپ سے وہ ادراک سے عاجز ہو کر قربِ حق سے دوری کے سبب غفلت کی وادیوں کی طرف چل پڑا اور مقامِ خصوصیت سے گر کر جہالت کو پسند کر کے جمال و کشف سے بے خبر اسرارِ الٰہی کی تحقیق سے لاپرواہ ہو گیا۔ فانی طمع و لالچ نے روحانی و قلبی رخ کو موڑ کر نفسی خواہشات کے طابع کر دیا۔ انسان کی اس کیفیت کو رب تعالیٰ قرآنِ پاک میں اس طرح ارشاد فرماتے ہیں:

ترجمہ: ''بے شک انسان ظالم و نادان ہے۔''

اگرچہ انسان کا لغوی مطلب ہی بھلکڑ ہونا ہے مگر جس علم کی بنا پر وہ اشرف المخلوقات بنا، اسی کو بھول بیٹھا۔ اس کے باوجود ہر دور میں اللہ نے اپنے محبوب بندے بھیجنے کا سلسلہ جاری رکھا جو ہر سانس کے ساتھ اپنے مالک کے شکر گزار رہتے ہوئے اس کی لاتعداد نعمتوں کے احسان مند رہتے۔ اپنے ان پیاروں سے خالقِ حقیقی اس طرح مخاطب ہوئے۔

ترجمہ: ''چھوڑ دے ان کو کہ کھائیں اور فائدہ اٹھائیں اور غافل کرے ان کو آرزو دراز پس البتہ معلوم ہو جائے گا۔''

(سورۃ الحجر۔ آیت: 3)

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رب سے غافل ہونا اپنی مصروفیات کی وجہ سے نہیں بلکہ اعمال کی وجہ سے ہے کہ اللہ ان کو غفلت میں رکھتا ہے۔ ایسا تب ہوتا ہے جب انسان لاعلم ہو جائے۔ وہ اپنے مقاصدِ تعلیم بھلا کر نفس امارہ کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ انسانی دماغ ایک قدرتی کان کی مانند ہے۔ جس کو جتنا ہنر کان کنی کا آئے گا، اسی کے مطابق وہ ان ذخائر سے فائدہ اٹھا سکے

گا ورنہ اس لازوال نعمت سے محروم رہ جائے گا۔ اب یہ اس پر منحصر ہے۔ مسلمان ہونے کے ناطے ہم اپنے تعلیمی مقاصد اسلام کے دائرے میں رہ کر تیار کرتے ہیں۔ یہاں ایک بہت بڑی غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر تفرقوں میں بٹے مسلمانوں نے دوریاں پیدا کر دیں۔ اکثر کا یہ خیال ہے کہ جو علوم ہم پر فرض کیے گئے وہ صرف توحید و رسالت ہیں، نماز، روزہ، زکوۃ اور حج کے متعلق ہی ہونگے یعنی جو مدارس میں پڑھایا جاتا ہے۔ اگرچہ ان کا ذکر قرآنِ پاک میں سب سے زیادہ کیا گیا ہے لیکن ان کے ساتھ نافع علوم بھی فرض کیے گئے جن سے دین اور دنیا دونوں میں استفادہ ہو۔ آج کے دور میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی دوڑ میں غیر مسلم ہم سے آگے ہیں مگر ان تمام علوم کی بنیاد مسلمانوں نے رکھی۔ مروان ثانی کے دورِ حکومت میں جب بغداد پر حملہ ہوا تو دشمن نے لائبریریاں خالی کر لیں۔ تاریکی میں بھٹکنے والی اقوام نے مسلمانوں کے تجربات سے فائدہ اٹھا کر سائنس کی دنیا میں عروج حاصل کیا۔ علم جن کی میراث تھی، وہ ایک دوسرے پر فتوے لگانے میں مصروف رہے جبکہ غیر مسلم سبقت لے گئے۔

قرآنِ پاک کی ایک آیت میں مسلمانوں کو اپنے گھوڑے تیار رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے پیچھے بہت بڑا فلسفہ ہے۔ اس دور میں گھوڑے آلاتِ جنگ میں شمار ہوتے تھے یعنی مسلمانوں کو اپنا دفاعی نظام مضبوط کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اب چونکہ جدید ہتھیاروں کا دور ہے تو وقت، حالات اور ضرورت کے مطابق ہمیں گھوڑے کی جگہ اسلحہ بارود ایٹم بم، میزائل اور وہ تمام آلاتِ حرب جو مملکت کی حفاظت کے لیے ضروری ہیں، کے متعلق علوم حاصل کرنا فرض ہے۔ جب ہم اپنی عزت، جان و مال اور سرحدوں کو محفوظ بنا لیں گے، تب اسلام کے مطابق آزادانہ زندگی بسر کر سکیں گے۔ بالکل اسی طرح ہمیں تمام شعبۂ ہائے زندگی میں آگے بڑھنا ہے کیونکہ علم مومن کی میراث ہے۔ اس کی تلاش وحصول، زمان ومکان کی پابندی سے آزاد ہر مسلمان، عورت اور مرد پر فرض کر دیا گیا ہے لیکن ترقی کی راہ میں اپنی دینی واخلاقی حدود پار کرنے سے سختی سے منع فرمایا گیا۔ ورنہ کیا ہوگا؟...... سورۃ الانعام میں ارشادِ ربانی ہے۔

ترجمہ: ''کہہ کہ سیر کرو بیچ زمین کے پھر دیکھو کیونکر ہوا آخر کام جھٹلانیوالوں کا۔''

(الانعام۔آیت:11)

اس آیت میں زمین پر سیر کے ذریعے کیا دیکھنے کی طرف اشارہ ہے؟ پہلی اقوام کی بستیاں جیسے قوم عاد و ثمود، جن کو پہاڑ کاٹ کر گھر بنانے کا علم اور طاقت دی، جس قوم کے قد ستر فٹ تھے، ان کے گھر کتنے بڑے ہوں گے، لیکن جب وہ اپنے علم و عقل پر متکبر ہو گئے تو ان کا کیا انجام ہوا؟ اسی طرح ہمیں اپنی آزادی کے مطابق سائنس اور ٹیکنالوجی کی دوڑ میں آگے آنا ہے تا کہ مسلمان پس ماندہ نہ رہ جائیں۔ آزادی اور پابندی کا امتزاج شاعر اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پابہ گل بھی ہے
انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

ہر انسان پر تمام علوم کا حصول فرض نہیں کیونکہ علم کی کوئی حد مقرر نہیں۔ اس لیے یہ کسی کے بس میں نہیں کہ وہ تمام علوم پر دسترس حاصل کر سکے۔ البتہ زندگی گزارنے کے لیے جن علوم کی ہمیں ہر وقت ضرورت پڑتی ہے، انہیں ضرورت کے مطابق سیکھ لینا چاہئے مگر دین کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔ علم اور عمل دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ جیسے عمل بغیر علم کے ممکن نہیں اسی طرح علم بغیر عمل کے فائدہ مند نہیں۔ اس لیے ابتدائی تعلیم کا نصاب کچھ ایسا ہونا چاہئے کہ اس عمر میں زندگی کا حصہ بن سکے مثلاً آدابِ زندگی، اخلاقیات، عادات و اطوار، محض پڑھانے کی بجائے ان پر سختی سے عمل کرنے کی ترغیب دی جائے۔ قبل ازیں والدین اور اساتذہ کو اس پر پہلے خود عمل کرنا ہوگا۔ نئی نسل وہی کرتی ہے جو اپنے بڑوں کو کرتے دیکھتی ہے۔ عمل کی ریاضت سے رٹہ سسٹم کو ختم کرنا ہوگا۔ اس کا تعلق ذہانت سے نہیں بلکہ حافظہ سے ہے۔ اس طرح وقتی طور پر اچھی پوزیشن ہی ملے گی لیکن عملی زندگی میں کامیابی بالکل یقینی نہیں۔

بے عمل علم کا سفر کنویں کے مینڈک جیسا ہے۔ بچوں کو ابتدا ہی میں حصولِ تعلیم کے مقاصد سے آگاہ کرنا بے حد اہم ہے تا کہ وہ انسان سے اللہ کا بندہ بننے کا سفر شروع کر سکیں۔ یہ علم ہی ہے جو انسان کو اللہ کی پہچان، بندگی اور دنیا کے اسرار و رموز سکھاتا ہے، حصولِ علم کے بعد ہی ہم عزت اور ذلت میں فرق واضح کر سکتے ہیں۔ معاشرے کی بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ نئی نسل کو سرکاری نوکری کا خواب دکھا کر اسے کام چوری کا درس دیا جاتا ہے۔ ہر انسان میں کچھ خداداد صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ ان کو بروئے کار لا کر اپنی منزل کو تلاش کرنا چاہئے۔

ہم اپنی ہمت اور صلاحیت کے بل بوتے پر تمام مسائل کو حل کر سکتے ہیں۔ انسانی جبلت ہے

کہ وہ ہمیشہ آسان راستہ ڈھونڈتا ہے لیکن کامیابی صرف انہی کا مقدر ہے جو راستے کی بجائے منزل پہ نظر رکھتے ہیں اور دنیا کی رنگینیوں کو اپنے پاؤں کی زنجیر نہیں بننے دیتے بلکہ ہمت کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے ستاروں سے آگے کے جہانوں کی تلاش ترک کردی تو زوال کا آغاز شروع ہوا۔ شاعر سید منظر عباس نے اس کے بارے میں کچھ یوں فرمایا ہے:

ہوا میں لے کے کہاں جائے گی اڑان مجھے
تراشا ہے زمیں پر ہی آسمان مجھے

29 نومبر 2018ء

یہ عشق نہیں آساں!

میدانِ وفا دربار نہیں، یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں
گر بازی، عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

اگر کسی چیز کی حقیقت معلوم کرنا مقصود ہو تو سب سے پہلے اس کی ہیئت کو دیکھا جاتا ہے لیکن جذبات کی کوئی ہیئت نہیں ہوتی۔ انہیں دیکھنا اور ناپنا ممکن نہیں، صرف محسوس کیا جاتا ہے۔ البتہ نام سے مدد لی جا سکتی ہے کیونکہ ان کے نام ہی اصل پہچان ہے۔ جیسا کہ عشق۔ اصولاً اس کے مادر ورڈ کو دیکھنا چاہئے۔ یہ عربی زبان کے لفظ عشقہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جب کسی چیز کو کسی سے تشبیہ دی جاتی ہے تو ان دونوں میں کچھ مماثلت کا ہونا ضروری ہے۔ اردو زبان صدیوں سے بولی جانے والی مشترکہ زبانوں کا مجموعہ ہے لیکن ہم ان زبانوں کو جانتے نہیں۔ اس لیے ان کے معنی سے واقف نہیں۔ صرف شکلیں یاد ہیں۔ اس طرح کی کسی چیز کے معنی دیکھنا ہو تو ہم اکثر شعراء کے کلام سے مدد لیتے ہیں جو کہ اس کی تعریف نہیں ہوتی بلکہ علامات ہوتی ہیں۔ جیسا کہ اوپر والے اشعار میں فیض احمد فیضؔ نے عشق کی بتائی ہیں۔ ''عشقہ'' عربی میں آکاس بیل کو کہا جاتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ عشق اور آکاس بیل میں کیا قدر مشترک ہے۔ فیض صاحب کہتے ہیں کہ عشق نام و نسب اور ذات نہیں دیکھتا، بالکل اسی طرح آکاس بیل کو جس درخت پر ڈال دیا جائے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ کس چیز کا ہے۔ خاردار کانٹوں والا، نرم و نازک پتیوں والا، مزیدار پھل والا یا ان تمام نعمتوں سے محروم، سب برابر، وہ پوری ایمانداری کے ساتھ اس رشتے کو دل سے قبول کرتے ہوئے اس کے ساتھ منسلک ہو کر اپنی زندگی کا آغاز کرتی ہے۔ اس میں خاصیت یہ بھی پائی جاتی ہے کہ اس شجر کا حصہ بن کر اپنی تمام تر ذمہ داریاں اس پر ڈال کر بے فکر ہو جاتی ہے۔ اس کا زمین

سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس لیے خوراک درخت سے حاصل کر کے وفاداری اس طرح نبھاتی ہے کہ اپنا جینا مرنا اس کے نام کر دیتی ہے۔

اب یہاں کلیہ (ون پلس ون از ایکوئل ٹو ون) 1=1+1 لگے گا جو کہ ریاضی کے کسی اصول پر نہیں آتا اسی لیے کہا جاتا ہے کہ عشق کے اپنے اصول ہوتے ہیں۔ دوسرے شعر کے مطابق اگر عشق کا کاروبار ہو اور سب کچھ لگانا پڑے، بے فکر ہو کر لگا دو، جیت ہو یا ہار، دونوں صورتوں میں ہی فائدہ ہے۔ یہ منطق کم لوگوں کی سمجھ میں آتی ہے۔ جس طرح آکاس بیل درخت سے اپنی خوراک حاصل کرتی ہے۔ ایک پروڈیوسر اور دوسرا کنزیومر بن جاتے ہیں، غذائی قلت کی بنا پر دونوں ہی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ یہی تعلق عاشق اور عشق کے مابین ہے۔ فرق صرف یہ کہ عشق خواہشِ نفس پر قبضہ کرتا ہے، وہیں پلتا ہے اور مکمل غلبہ پا کر اسے ہلاک کر ڈالتا ہے۔ خواہشِ نفس کی موت انسان کی جیت ہوتی ہے کیونکہ بندہ ایک پاؤں نفس پر رکھے تو دوسرا جنت میں ہوگا۔ وہ اب انسان سے بندہ بن چکا ہے اور بندہ بندگی سے ہے۔ اس لیے ہار بھی جیت کے برابر ہوتی ہے۔ اگرچہ عشق کی تعریف کے ہر دور میں پل باندھے گئے، ہر صاحبِ علم و عقل، دانشور مفکر، ادیب اور شاعر نے اپنے تجربات و ادراک کے مطابق طبع آزمائی کی لیکن زیادہ تر نے اس کی یہی علامات بتائیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجئے
اک آگ کا دریا ہے۔ اور ڈوب کے جانا ہے

انسان جسم اور روح کے ملاپ سے زندہ ہے۔ جسم ظاہری اور روح باطنی ہے۔ ان دونوں کے زندہ رہنے کے لیے غذائی ضرورت فطری عمل ہے۔ روح کی بنیادی ضرورتیں علم اور محبت ہیں۔ جیسے ہی انسان کا بچہ کچھ پکڑنے کے قابل ہوتا ہے، جو چیز اس کے ہاتھ آئے، منہ میں ڈال کر دیکھتا ہے کہ یہ کیا ہے؟ سخت ہے یا نرم؟ اس کا ذائقہ کیسا ہے؟ پھر زمین پر پھینکے گا۔ مضبوطی دیکھنے کے لیے یہاں سے سیکھنے کا عمل شروع ہو کر آخری سانس تک جاری رہتا ہے۔ اس کا سفر آسانی سے مشکل کی طرف ہے۔ دل کی فطرت ہے محبت کرنا، وہ کرے گا، کائنات کی ہر چیز سے، کیونکہ خالقِ کائنات نے اس کے دل میں محبت کا بیج رکھ دیا۔ انسان کیا، جانوروں میں بھی یہ خاصہ ہے لیکن اس کا اطلاق بعض اوقات غلط بھی ہو جاتا ہے۔ جب محب چاہے کہ محبوب اس کی مرضی کے مطابق

ڈھل جائے، یہ محبت نہیں۔ دوسرے کی مرضی کے مطابق خود کو ڈھال لینے کا نام محبت ہے۔ کسی دوسرے کو اپنی پسند کے مطابق چلانے کا نام محبت نہیں ہے۔ اس کا حصول کیا نشانی چھوڑتا ہے؟

محبت کیا نشانی چھوڑ جاتی ہے
فقط آنکھوں میں پانی چھوڑ جاتی ہے
کبھی آئے جو اس کا نام محفل میں
تو دھڑکن بھی روانی چھوڑ جاتی ہے

محبت کی مثال بھی ایسے ہی ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے۔

ترجمہ: ''تحقیق جو لوگ کہ ایمان لائے اور کام کیے اچھے البتہ کرے گا واسطے ان کے رحمن محبت۔'' (سورۃ مریم۔ آیت: 96)

اب محبت کے لیے شرط کیا ہے؟ پہلی ایمان کی دوسری عملِ صالح کی، گویا محبت توحید کا بیج ہے۔ جب کسی سے ہوتی ہے، تب دنیا میں اس جیسا کوئی نہیں دکھتا۔ وہ واحد ہے۔ یہی توحید ہے۔ پھر محب کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ محبوب سے باتیں کرے، اس کی تعریف کرے، تو وہ نماز کے لیے کھڑا ہوگا۔ شدّت میں اضافہ ہوا کہ اب کچھ ایسا کرنا چاہتا ہے جو محبوب کو بہت پسند ہو، جس سے وہ خوش ہو جائے، پھر وہ روزے کا اہتمام کرتا ہے۔ اب محبوب کی خوشنودی کے لیے جو چیز اس کو پسند ہوتی ہے، اپنی حیثیت کے مطابق اس تک پہنچانا چاہتا ہے تو وہ زکوٰۃ ادا کرتا ہے، صدقہ دیتا ہے اور خیرات کرتا ہے۔ اس کے دل میں تڑپ پیدا ہوتی ہے کہ میں دیکھوں محبوب کیسا ہے؟ اگرچہ اس کو یقین ہو کہ وہ مل نہیں پائے گا، دیکھ نہیں سکتا، پھر بھی اس کے شہر، اس کی گلیوں میں چکر لگانا چاہتا ہے اور وہ حج کا سفر شروع کرتا ہے۔ میری ناقص رائے کے مطابق تو محبت سے عشق تک، توحید سے حج کا سفر ہے جو کہ آساں نہیں۔ کیونکہ حج صرف ادا نہیں کرنا، اسے برقرار بھی رکھنا ہے۔ جو وعدے اللہ سے کیے، ان پر عمل بھی کرنا پڑتا ہے اور حج ادا کرنے کے بعد انسان کی کیفیت ایسی ہوتی ہے جیسے نومولود کی کیونکہ اس سے پہلے کے گناہ توبہ کے بعد معاف ہو جاتے ہیں سوائے حقوق العباد کے، بشرطیکہ وہ دل سے توبہ کرے اور آئندہ ایسے کاموں سے بچنے کا مصمم ارادہ کرے۔

واللہ اعلم۔

یکم دسمبر 2018ء

خود بنیں اپنی پہچان!

بیرونی فتنوں سے بچنے کے لیے انسان کو اپنی آنکھیں کھلی رکھ کر اللہ کی مخلوق کی طرف سے ملنے والی عزت افزائی، مدح وستائش کو کسوٹی پر پرکھنا چاہئے کیونکہ دوسروں کی بے جا تعریف سے ہم اپنے افعال پر خوش ہو کر خامیوں کو نہیں دیکھ پاتے۔ کسی چیز کے وجود کا احساس ختم ہو جانے پر اس کی اصلاح ناممکن ہو جاتی ہے۔ ملامت کا عنصر ناتواں ہو جائے تو بندہ اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت سمجھنے لگتا ہے کہ ہر دلعزیز ہو گیا ہوں۔ وہ کیوں بھول جاتا ہے کہ کلمہ ٔحق منہ سے نکالنے والوں کو تنگی و مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ علامتِ خوش بختی نہیں، بلکہ خوشامد پرستی ہے جو ہمارے معاشرے میں گردوغبار کی طرح پھیل کر نظر سے پوشیدہ ذرات سے نہ صرف انسانی وجود کو امراض کی ''سوغات'' پیش کر رہی ہے۔ بلکہ امراضِ قلبی و روحانی کا سبب بن کر جان لیوا زہر کی طرح رواج پا چکی ہے۔ نتائج کے خوف سے آزاد ہو کر ہر ایک اسے شوق سے کھاتا ہے لیکن اپنے آپ کو پہچاننے کا تریاق اس کے اثرات کو نہ صرف زائل کرنے کی طاقت رکھتا ہے بلکہ اپنے اندر چھپے گوہرِ نایاب کے ذخائر سے گردونواح کے ماحول کو معطر کر کے مالکِ کونین کی اس لازوال نعمت سے اپنے علاوہ دوسروں کو بھی مستفید کر سکتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوق کے لقب سے نواز کر ثابت کیا کہ تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ پیار صرف انسان سے ہے۔ اب یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرے۔ کچھ لوگ اس پر اس طرح عمل کرتے ہیں جن کا ذکر جناب ہارون الرشید تبسم نے اپنے شعر میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔

تیری الفت کے سمندر میں چھپا کر ذات کو
سیپ میں تیرے گہر پھر ڈھونڈ تا رہتا تھا میں

آج کا انسان ابن الوقت بن کر فانی دنیا کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ ہر طرف دوڑ لگی ہوئی ہے۔ غریب روٹی کھانے کیلئے بھاگ رہا ہے جبکہ امیر ہضم کرنے کے لیے۔ دونوں ایک دوسرے کے

لیے باعثِ عبرت ہیں لیکن نشانیاں ہیں عقل والوں کے لیے۔ اپنی ذات کا علم ہر طالبِ حق پر فرض ہے کیونکہ جب انسان کو معرفتِ الٰہی کا مکلف بنایا گیا، سب سے پہلے اسے اپنی معرفت ہونی چاہئے کہ میں کون ہوں؟ مجھے کس نے بنایا؟ کس مقصد کے لیے بنایا؟...... یہ تجسس اس کو خالق تک پہنچائے گا۔ ایک حدیثِ پاک کے الفاظ ہیں "**من عرف نفسه فقد عرف ربه**"......

ترجمہ: جس نے اپنے نفس کو پہچانا، اس نے اپنے رب کو پہچانا۔

جب وہ یہ جان لے گا کہ بالآخر مجھے فنا ہونا ہے تو اس کے دل میں خوفِ خدا پیدا ہوگا۔ ایک شخص سے دوسرے کے تعلق کی بنیاد انسانیت کا رشتہ ہے۔ قادرِ مطلق محض اللہ کی ذات ہے۔ جو قومیں یہ بھول کر غلامی کی زنجیر پہن لیتی ہیں، ان کا انجام اساطیر الاوّلین میں ملتا ہے جس کی ایک بڑی مثال فلسطین کی اسرائیلی قوم کا طویل مدت تک مصریوں کی غلامی میں جکڑے رہنا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی ولادت کے موقع پر مصر میں بنی اسرائیل فرعونِ مصر کی غلامی کے اس حد تک عادی ہو چکے تھے کہ آزادی کے مفہوم سے بھی ناآشنا تھے۔ جس چیز کا علم نہ ہو، اس پر عمل کیسے ہوگا؟ ظلم وستم کے آگے احتجاج سے ناواقف قوم کو جب اللہ کے حکم پر اس کے نبیؑ نے آزاد کروایا تو مالکِ دوجہاں کا شکرادا کرنے کے بجائے طرح طرح کی فرمائشیں کرنے لگی۔ کبھی ان کے لیے من وسلویٰ اترتا تو کبھی سمندر راستہ دیتا، کبھی پہاڑوں کے پھٹنے سے چشمے بہہ نکلتے...... یہ ساری نعمتیں پانے کے باوجود اللہ کی ناشکری کرتے۔ تقریباً چھ لاکھ نفری کب تک صحرا میں بھٹکتی رہتی، اس لیے ان کو شہر پر حملے کا حکم ملا تو انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے تامل کیا کہ دشمن طاقتور ہے۔ ہم اس کا مقابلہ نہیں کر پائیں گے۔ سوائے دوافراد کے سب انکاری ہو گئے۔ جب انہیں دشمن پر یقینی فتح کی نوید سنائی گئی، انہیں یقین تو تھا کہ اللہ کا وعدہ سچا ہوگا لیکن انہوں نے مطالبہ کیا کہ پہلے آپ اور آپ کا خدا اس قوم کو شہر سے بے دخل کریں، تب تک ہم یہیں انتظار کریں گے۔ انہوں نے ایسا کیوں کہا؟ ایک تو ان کی ہر ضد ابھی تک پوری ہوتی آ رہی تھی، وہ اللہ کے نبیؑ کے ذریعے ہر بات منوا لیتے تھے، دوسرا آزادی کی اہمیت سے ناواقف تھے اور تیسرا ذہنی طور پر غلام بن چکے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ ان میں حملہ کرنے کی طاقت نہ تھی۔ یہ قوم تقریباً چالیس سال تک صحراؤں میں بھٹکتی پھری، شہری ماحول سے دور، یہاں تک کہ نئی نسل پروان چڑھ گئی۔ صحرا میں زندگی بسر کرنے کا کوئی ڈھنگ نہ تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ مصری تمدن سے نابلد یہ لوگ طویل مدت تک ذہنی طور پر یرغمال

خود بنیں اپنی پہچان!

بیرونی فتنوں سے بچنے کے لیے انسان کو اپنی آنکھیں کھلی رکھ کر اللہ کی مخلوق کی طرف سے ملنے والی عزت افزائی، مدح وستائش کو کسوٹی پر پرکھنا چاہئے کیونکہ دوسروں کی بے جا تعریف سے ہم اپنے افعال پر خوش ہو کر خامیوں کو نہیں دیکھ پاتے۔ کسی چیز کے وجود کا احساس ختم ہو جانے پر اس کی اصلاح ناممکن ہو جاتی ہے۔ ملامت کا عنصر ناتواں ہو جائے تو بندہ اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت سمجھنے لگتا ہے کہ ہر دلعزیز ہو گیا ہوں۔ وہ کیوں بھول جاتا ہے کہ کلمہ ٔحق منہ سے نکالنے والوں کو تنگی ومصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ علامتِ خوش بختی نہیں، بلکہ خوشامد پرستی ہے جو ہمارے معاشرے میں گرد وغبار کی طرح پھیل کر نظر سے پوشیدہ ذرات سے نہ صرف انسانی وجود کو امراض کی ''سوغات'' پیش کر رہی ہے۔ بلکہ امراضِ قلبی وروحانی کا سبب بن کر جان لیوا زہر کی طرح رواج پا چکی ہے۔ نتائج کے خوف سے آزاد ہو کر ہر ایک اسے شوق سے کھاتا ہے لیکن اپنے آپ کو پہچاننے کا تریاق اس کے اثرات کو نہ صرف زائل کرنے کی طاقت رکھتا ہے بلکہ اپنے اندر چھپے گوہرِ نایاب کے ذخائر سے گرد ونواح کے ماحول کو معطر کر کے مالکِ کونین کی اس لازوال نعمت سے اپنے علاوہ دوسروں کو بھی مستفید کر سکتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوق کے لقب سے نواز کر ثابت کیا کہ تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ پیار صرف انسان سے ہے۔ اب یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرے۔ کچھ لوگ اس پر اس طرح عمل کرتے ہیں جن کا ذکر جناب ہارون الرشید تبسمؔ نے اپنے شعر میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔

تیری الفت کے سمندر میں چھپا کر ذات کو

سیپ میں تیرے گہر پھر ڈھونڈتا رہتا تھا میں

آج کا انسان ابن الوقت بن کر فانی دنیا کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ ہر طرف دوڑ لگی ہوئی ہے۔ غریب روٹی کھانے کیلئے بھاگ رہا ہے جبکہ امیر ہضم کرنے کے لیے۔ دونوں ایک دوسرے کے

لیے باعثِ عبرت ہیں لیکن نشانیاں ہیں عقل والوں کے لیے۔ اپنی ذات کا علم ہر طالبِ حق پر فرض ہے کیونکہ جب انسان کو معرفتِ الٰہی کا مکلف بنایا گیا، سب سے پہلے اسے اپنی معرفت ہونی چاہیے کہ میں کون ہوں؟ مجھے کس نے بنایا؟ کس مقصد کے لیے بنایا؟...... یہ تجسس اس کو خالق تک پہنچائے گا۔ ایک حدیثِ پاک کے الفاظ ہیں "**من عرف نفسه فقد عرف ربه**"......

ترجمہ: جس نے اپنے نفس کو پہچانا، اس نے اپنے رب کو پہچانا۔

جب وہ یہ جان لے گا کہ بالآخر مجھے فنا ہونا ہے تو اس کے دل میں خوفِ خدا پیدا ہوگا۔ ایک شخص سے دوسرے کے تعلق کی بنیاد انسانیت کا رشتہ ہے۔ قادرِ مطلق محض اللہ کی ذات ہے۔ جو قومیں یہ بھول کر غلامی کی زنجیر پہن لیتی ہیں، ان کا انجام اساطیر الاوّلین میں ملتا ہے جس کی ایک بڑی مثال فلسطین کی اسرائیلی قوم کا طویل مدت تک مصریوں کی غلامی میں جکڑے رہنا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کی ولادت کے موقع پر مصر میں بنی اسرائیل فرعونِ مصر کی غلامی کے اس حد تک عادی ہو چکے تھے کہ آزادی کے مفہوم سے بھی ناآشنا تھے۔ جس چیز کا علم نہ ہو، اس پر عمل کیسے ہوگا؟ ظلم و ستم کے آگے احتجاج سے ناواقف قوم کو جب اللہ کے حکم پر اس کے نبیؑ نے آزاد کروایا تو مالکِ دوجہاں کا شکر ادا کرنے کے بجائے طرح طرح کی فرمائشیں کرنے لگی۔ کبھی ان کے لیے من وسلویٰ اترتا تو کبھی سمندر راستہ دیتا، کبھی پہاڑوں کے پھٹنے سے چشمے بہہ نکلتے...... یہ ساری نعمتیں پانے کے باوجود اللہ کی ناشکری کرتے۔ تقریباً چھ لاکھ نفری کب تک صحرا میں بھٹکتی رہتی، اس لیے ان کو شہر پر حملے کا حکم ملا تو انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے تامل کیا کہ دشمن طاقتور ہے۔ ہم اس کا مقابلہ نہیں کر پائیں گے۔ سوائے دو افراد کے سب انکاری ہو گئے۔ جب انہیں دشمن پر یقینی فتح کی نوید سنائی گئی، انہیں یقین تو تھا کہ اللہ کا وعدہ سچا ہوگا لیکن انہوں نے مطالبہ کیا کہ پہلے آپ اور آپ کا خدا اس قوم کو شہر سے بے دخل کریں، تب تک ہم یہیں انتظار کریں گے۔ انہوں نے ایسا کیوں کہا؟ ایک تو ان کی ہر ضد ابھی تک پوری ہوتی آ رہی تھی، وہ اللہ کے نبیؑ کے ذریعے ہر بات منوا لیتے تھے، دوسرا آزادی کی اہمیت سے ناواقف تھے اور تیسرا ذہنی طور پر غلام بن چکے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ ان میں حملہ کرنے کی طاقت نہ تھی۔ یہ قوم تقریباً چالیس سال تک صحراؤں میں بھٹکتی پھری، شہری ماحول سے دور، یہاں تک کہ نئی نسل پروان چڑھ گئی۔ صحرا میں زندگی بسر کرنے کا کوئی ڈھنگ نہ تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ مصری تمدن سے نابلد یہ لوگ طویل مدت تک ذہنی طور پر یرغمال

رہے۔ انہی کی نئی نسل نے جب دورِ غلامی سے چھٹکارا پایا تو پھر اسی قوم نے پے در پے فتوحات کے انبار لگا دیے۔ حضرت موسیٰؑ نے اللہ کے حکم پر اپنی قوم کو فرعون سے نجات دلا کر انہیں اللہ کی طرف سے مقدس کتاب ''توریت'' کا تحفہ دیا اور اس کے مطابق عمل کرنے کا حکم دیا۔

اسی نظریہ کے تحت ہمارے قائد محمد علی جناحؒ نے بھی ایک آزاد مملکت کے حصول کیلئے جدوجہد کی تا کہ ہم بھی اللہ کی کتاب قرآنِ پاک اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق آزادی سے زندگی بسر کر سکیں لیکن ہم آج تک اپنے رسم و رواج، تہذیب و ثقافت، نصابِ تعلیم اور معاشی و معاشرتی نظام بدل نہیں سکے بلکہ ابھی تک ہمارے ہاں آزادی سے قبل کے قوانین رائج ہیں۔ ہم اپنی سوچ تک نہیں بدل سکے کہ اللہ کے حکم اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق اس مملکتِ خداداد کے نفاذ میں ہمارے معاشرے کی فرسودہ روایات اور ذاتی انا آڑے آتی ہیں۔ میں تو محض یہی کہہ سکتی ہوں کہ:

نہ ضد کی بات نہ ہی مسئلہ وفا کا ہے
معاملہ تو مگر اب بڑا انا کا ہے

جبکہ اس کے برعکس اس بات کی فکر ہونی چاہئے کہ ہم اللہ رب العزت کے سامنے کیسے جائیں گے اپنے شفیق نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سامنا کیسے کریں گے؟ قرآنِ کریم کے احکامات پر کس حد تک عمل کیا، اس کا کیا جواب دیں گے؟ ایسا اس لیے ہے کہ ہم بھول چکے ہیں کہ کائنات ہمارے لیے بنائی گئی، ہم کائنات کے لیے نہیں۔ ہمیں اپنا مقام و مرتبہ یاد نہیں۔ ایسا کلیہ جو غلامی کی زنجیروں سے جکڑے دماغوں کو آزاد کروائے، وہ یہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ''اور جو کوئی ڈرا کھڑے ہونے سے آگے پروردگار اپنے کے اور منع کیا جی اپنے کو خواہش سے پس تحقیق بہشت وہی ہے جگہ رہنے کی۔''

(سورۃ النازعات، آیات: 41-40)

جس نے نفس کو خواہش سے روکا، بیشک جنت اس کا مسکن ہے۔

6 دسمبر 2018ء

عظمت کے پاسباں!

جذبہ حب الوطنی سے سرشار افواجِ پاکستان کے جانبازوں کا ذکر آتا ہے تو تاریخ کے لاتعداد باب کھلتے ہیں اور ان کی قربانیوں کی داستانوں سے ہمارے سینے فخر سے تن جاتے ہیں۔ اگر ہماری فوج کے جوانوں اور وطن عزیز کے لازوال رشتے کو شمع اور پروانے سے تشبیہ دی جائے تو غلط نہ ہو گا۔ اِنہی پاسبانِ وطن کی بہادری کی وجہ سے ہماری قوم دنیا بھر میں نمایاں طور پر پہچانی جاتی ہے۔ ہماری افواج کے جوانوں میں یہ غیرت، شجاعت اور حمیت اللہ کے رسول ﷺ کی سنت پر عمل سے ملی ہے۔ جو غزوات ہمارے نبی ﷺ کے دور میں ہوئے، وہ مسلمانوں کیلئے رہنمائی کا باعث بنتے ہیں۔ ان کا مقابلہ کون کرسکتا ہے۔ یہ شان صرف مومن کی ہے۔ جن کو دلیری حضرت علیؓ شیرِ خدا کی طرف سے ملی ہو، وہ کسی میدان میں پسپا نہیں ہوتے۔ ان محبت کے سفیروں کا مقصدِ حیات اپنے لہو سے گلستان کے پھولوں کو مہکانا اور مصائب کا تبسم کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے۔ یہ اخلاق کے پیکر، وطن کے متوالے، سرحدوں کے رکھوالے، حق کی خاطر سر کٹانے والے، امن پر مر مٹنے والے، اوروں کو راہ دکھانے والے، اللہ کی نظر میں اونچی شان والے، جان دے کر بھی ہمیشہ زندہ رہنے والے اپنے آپ کو مشقتوں میں ڈال کر ہمارے لیے سکون کا سماں پیدا کرتے ہیں۔ دیس کی حفاظت کی خاطر جہاں یہ رہتے ہیں، وہاں جانا بھی کسی عام انسان کے بس کی بات نہیں۔ وہ کون سا جذبہ ہے، کون سا فرض ہے جس کی خاطر جان کی بازی لگانا اپنی خوش بختی سمجھتے ہیں؟ وہ محرک جذبۂ حب الوطنی ہے۔ دھرتی کو ماں سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ یہ ماں پر جان دیتے ہیں اور جن کی مائیں در بدر ہو رہی ہوتی ہیں، ان سے موازنہ کیا جائے تو یہ کتنے بڑے قد کے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ اس فرضِ منصبی کو نبھاتے ہوئے جس طرزِ زندگی کو اپناتے ہیں، کوئی جسمانی طور پر نفیس انسان نہیں اپنا سکتا۔ سیاچن کی برف پوش چٹانوں کی آغوش میں بیٹھ کر ہماری مسلح افواج کے جانباز نوجوان میجر شہزاد نیّر نے کچھ یوں شاعری کی ہے:

جہاں میں ہوں......

وہاں پر برف اندر برف اُگتی ہے!

جہاں اتنی بلندی ہے......

کہ سانسیں ڈگمگا اٹھیں!

وہاں سورج نظر آتا ہے مشکل سے......

جہاں پر دھوپ میں بس روشنی کا نام ہوتا ہے!

جہاں پارہ نہیں اٹھتا......

جہاں سبزہ نہیں اُگتا......

جہاں رنگوں کی پریوں کا کوئی میلہ نہیں لگتا

جہاں میں ہوں......

وہاں تصور کا چہرہ سوالی ہے

نمودِ فن سے خالی ہے......

وجودِ زن سے خالی ہے......

جہاں بچوں کی باتوں کا کوئی جھرنا نہیں بہتا

ایسی منظر کشی کو کیمرے کی آنکھ میں قید کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔اس کے بعد پاک آرمی کی قربانیوں کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ صرف شہادت ہی خوشی سے قبول نہیں کرتے بلکہ جن حالات میں ڈیوٹی دیتے ہیں، وہ بھی بہت مشکل عمل ہے۔اسی لیے ہر پاکستانی کے دل میں ان کی محبت جھلکتی ہے۔خود کو ان کی جگہ رکھ کر دیکھیں۔کیا ہم ایسی زندگی گزارنے کے عادی ہیں؟ گرمیوں میں بجلی بند ہو جانے پر اے سی کمروں میں بیٹھنے والے واپڈا اور حکومتِ وقت کو درجنوں گالیوں سے خراجِ عقیدت پیش کرنا فرضِ اولین سمجھتے ہیں۔ایسے ہی لوگ آرمی پر الفاظ کستے ہیں۔یہ ان کا جذبۂ ایمانی ہے، جدوجہد اور یقینِ محکم امن و خوشحالی کے ہدف حاصل کرتے ہیں۔ یہ عظمت و سرفرازِ وطن ان کے جسموں میں خونِ رواں بن جاتی ہے۔ہر گھڑی سنتِ حسینؓ کے لیے تیار رہنے والی پختہ اینٹیں ملک کے گرد مضبوط فصیل کا کام سرانجام دے رہی ہیں۔انہی کے وجود سے قوم محفوظ قلعہ میں آزادی سے سانس لے رہی ہے۔وہ بھی اس جذبے سے شاعر کہتا ہے:

جان دی ، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

جس کی خاطر یہ شوق و ذوق سے جان دیتے ہیں، اس مالک نے اعلانِ انعام پہلے سے بتا دیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں ان کو مردہ مت کہو بلکہ زندہ ہیں لیکن تم نہیں سمجھتے۔'' (سورۃ البقرہ۔ آیت: 154)

ملت اور وطن کی محبت کا مادہ جیسے ان کی فطرت میں شامل ہو، سامنے توپ ہو یا تلوار، ان کی حب الوطنی دیدنی ہوتی ہے۔ پاک دھرتی پر زندہ بھی شان سے رہتے ہیں اور جان بھی فخر سے پیش کرتے ہیں۔ ہمیں اپنی آرمی پر پورا بھروسہ ہے کہ ان کا جذبہ کبھی ماند پڑنے والا نہیں اور یہ میلی آنکھ سے دیکھنے والوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔ پاک آرمی دنیا میں اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ یہ فخر ہمیشہ قائم و دائم رہے گا۔ ہر میدان میں سرخرو ہو کر وطنِ عزیز کا نام آسمانِ دنیا میں قوسِ قزح کی طرح نمایاں کریں اور یہی آرمی ایک دن دنیا کے نقشے کو بدل دے گی۔ جب واضح الفاظ میں لکھا جائے گا کہ کشمیر پاکستان کا حصہ بن گیا۔ ان شاء اللہ!...... ہر مسلمان کو اپنی مرضی سے اسلام کے اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کا پورا حق ہوگا۔ وہ دن دور نہیں جب کشمیر کے شہداء کی قربانیوں کا صلہ ملے گا اور ان کا خون کبھی رائیگاں نہیں جائے گا۔ ان شاء اللہ!

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسمؔ اپنی نظم میں افواجِ پاکستان کیلئے نہایت خوبصورت الفاظ کا چناؤ کرتے ہیں:

یہ وہ سپاہی ہیں جن کا ڈنکا تمام دنیا میں بج رہا ہے
یہ پھول وہ ہیں کہ جن کے دم سے وطن کا گلزار سج رہا ہے
خدا کی رحمت ہے ساتھ ان کے کرے گا کیا کوئی زیر ان کو
ہے اتنا غیروں پہ خوف طاری سمجھ رہے ہیں وہ شیر ان کو
یہ ہاتھ کٹ بھی گئے تو تب بھی ترے علم کو نہ گرنے دوں گا
اے پاک دھرتی میں تیرا بیٹا میں تیری حرمت پہ کٹ مروں گا

13 دسمبر 2018ء

انڈے تا مرغی تک

مسخروں کا ٹولا جہاں کہیں نظر آئے گا، موضوعِ بحث ان کا انڈا اور مرغی ہوگا۔ ان کی بے نیازی کا یہ عالم کہ خود نہیں جانتے جو بول رہے ہیں۔ یہ تنقید ہے، طنز، فضول الکلامی یا توانائی حاصل کرنے کے لیے ان کی ضرورت؟ جس کو شرطِ زندگی سمجھ کر آغازِ صبح کرتے ہیں، اسے حقیر سمجھ کر مذاق اڑانے والے اپنے منہ پر آپ تھپڑ مارتے ہیں کیونکہ اپنی ضرورت نظر نہیں آتی، صرف حجم یا قیمت سے اہمیت کا اندازہ لگاتے ہیں۔ کوئی بھی چیز کارخانۂ قدرت میں چھوٹی یا بے فائدہ نہیں ہوتی۔ ہم اپنے اردگرد کا جائزہ لیں تو کتنی اشیا ہوں گی جن کی اہمیت سے ہم بالکل آگاہ نہیں مثلاً سوئی کو ا بنی روزمرہ زندگی سے نکال کر دیکھیں، تب اس کی اہمیت و کردار کا اندازہ ہوگا۔ بنیادی ضروریات میں سے خوراک کے بعد لباس ہے جو اس معمولی چیز کا مرہونِ منت ہے۔ اس کا کام کوئی مہنگی سے مہنگی چیز نہیں کر سکتی۔ تب اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ زندگی کیلئے غذا کا حصول لازم ہے۔ وجود سلامت رہے گا تو اس کی ضروریات بھی ہوں گی۔ ہمارے ملک کی تین چوتھائی آبادی گاؤں میں رہتی ہے۔ کچھ لوگ تو ایسے بھی ہوں گے جنہوں نے اپنی زندگی میں کبھی شہر نہ دیکھا ہوگا۔ انہیں کچھ علم نہیں کہ موٹروے اور میٹرو بس کیا ہیں؟ آپ شہرِ جدید میں رہیں یا دور دراز گاؤں میں، خوراک ہر ذی روح کی بنیادی ضرورت ہے۔ عصری تقاضوں کے تناظر میں شعوری فیصلہ سازی وقت کی ضرورت ہے۔ مہنگائی کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اشکوں کی برسات کو روکنا ضروری ہو گیا ہے تاکہ غریب کو دو وقت کا کھانا میسر ہو سکے۔ محتاجی کا لحاف اوڑھ کر بے بسی کی راگ مالا گانے والوں کے لیے کچھ سوچنا ان کے لیے نظام کو بدلنا بلند خیالی ہے۔ اسے ممکن بنانے کے لیے سوچ کو بدلنا ہوگا۔ نوکری کا طوق بڑے شوق سے بلکہ فخر سے اپنے گلے میں ڈالنے کے لیے تیار ہوتے ہیں مگر بے روزگاری نوکریوں سے نہیں روزگار سے ختم ہوگی۔ اپنے کاروبار میں آگے بڑھنے کے چانسز زیادہ ہوں گے کیونکہ اپنے کام میں محنت زیادہ کی جاتی ہے۔ آج جس کی ابتدا

چھوٹے درجے سے کریں، کل وہ بلندیوں تک لے کر جاسکتا ہے جبکہ نوکری پوری عمر نوکری ہی رہتی ہے۔

فطرتِ سلیمہ کا یہ خاصہ ہے کہ وہ کسی بھوکے، پیاسے اور دکھی کو دیکھ کر حرکت میں آتی ہے۔ خواہ وہ سیاستدان ہو، ادیب، صوفی، درویش یا شاعر، کسی کو تماشہ بنا کر اس پر ہنسنا دوسرے کے لیے کتنی تکلیف دہ کیفیت ہوتی ہے۔ بقولِ شاعر:

وہی فریب میں لا کر پھنسا گیا مجھ کو
لگا جو شخص حقیقت میں پارسا مجھ کو

پھر انہی کا ردِ عمل اور وہ بھی اتنی سادہ دلی سے۔ کمال کا انداز ہے شاعر کا:

وہ ہنس کے بول پڑا تھا تو میں نے جانے دیا
وگرنہ پیاری بڑی تھی مری انا مجھ کو

انڈا اور مرغی کا مذاق اڑانے والے اپنے گرد و نواح کا جائزہ لے کر بتائیں کہ دونوں چیزیں ان کے لیے کتنی اہم ہیں۔ اگر ایک دن نہ ملیں تو کیا گزارا ہو سکتا ہے؟ ان کی قیمت کتنی بھی بڑھ جائے، باعثِ فکر نہیں۔ آج کل پچیس روپے کا ایک دیسی انڈا مل رہا ہے جو غریب کی پہنچ سے باہر ہے۔ اس کو اپنا روزگار بنا کر بے روزگاری بھی ختم کرلے اور ضرورت بھی پوری۔ مرغی خانوں میں مزدور کام کرتے ہیں۔ وہ فارم بڑے پیمانے پر ہوتے ہیں، اس لیے کاروباری منصوبے کہلاتے ہیں اور مالکان بڑے فخر سے بتاتے اور پیسہ کماتے ہیں۔ اگر یہی کام غریب چھوٹے پیمانے پر کرے تو باعثِ شرم سمجھا جاتا ہے۔ ذرا سوچیے کہ اگر غریب شخص اپنے پاؤں پہ کھڑا ہوگا تو اس کا کنبہ پیٹ بھر کھانا کھائے گا۔ سوال یہ ہے کہ اگر غریب کا وجود ہی نہیں ہوگا تو دولت مند اپنی امارت کسے دکھائے گا؟ ان کے کام کون کرے گا؟ مزدور نہیں تو فیکٹری کارخانہ، مل، پلازے سب کون چلائے گا؟ اپنی ترقی کے لیے دوسروں کی سوچ کو قید کرو، ورنہ دولت و اقتدار کو تکیہ بنا کر غفلت کی نیند سونے والے بیدار ہو جائیں، کیا یہ انسانیت ہے؟ اس میں حواس باختہ ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ ظلمتِ ذات سے نکل کر نئی جہت کا سراغ لگانے کے لیے صحرا کے ریگزاروں پر چل کر اپنے لیے راہ متعین کرنا پڑتی ہے، تبھی منزل کے نشاں ملتے ہیں۔ اندھیرا مٹانے کے لیے چراغ جلانا پڑتا ہے۔ فلک بوس منزل تک پہنچنے کیلئے پہلی سیڑھی پر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ آؤ سب مل

کر سوچیں اور اپنی سوچ کو عمومی بنائیں۔ ہم مسلمان ہیں اور ہمارا یہ ایمان ہے کہ کائنات کی سب سے افضل و اعلیٰ ہستی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں جنہوں نے بکریاں بھی چرائیں، اپنا ہر کام اپنے ہاتھ سے کیا تاکہ امت کو شرمندگی نہ ہو اور ساتھ اجرِ عظیم بھی ملے۔ اس تعلیم کو بھلا کر ہم کیا ترقی کر پائیں گے؟ چھوٹے کاروبار کا مذاق اڑانے والوں نے شاید آپ کا ایک واقعہ نہیں پڑھا جب ایک صحابیؓ نے آکر کہا کہ گھر میں کچھ کھانے کو نہیں اور کاروبار بھی نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا کہ کچھ بھی نہیں؟ صحابیؓ نے کہا کہ بس ایک پیالہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ منگوا کر بیچا۔ اس پیسہ سے کلہاڑی منگوا کر اپنے دستِ مبارک سے دستہ ڈالا اور فرمایا کہ جنگل میں جا کر لکڑیاں کاٹیں اور بیچیں کیونکہ محنت میں عظمت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی مدد بھی کر سکتے تھے، صحابہؓ کے ذریعے مدد کروا بھی سکتے تھے مگر ایسا نہیں کیا۔

ہم کیسے مسلمان ہیں؟ سود پر لیا گیا قرض مالِ غنیمت سمجھ کر کھا لیتے ہیں اور کام کرتے ہوئے اپنا سٹینڈرڈ دیکھتے ہیں۔ کام میں کوئی عار نہیں۔ دنیا جس کو دی، وہ بھی امتحان میں، اور جس کو نہیں دی، وہ بھی امتحان میں۔ مفلس کو صبر کی تلقین کی گئی۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ **ان اللہ مع الصابرین۔**

ترجمہ: بے شک اللہ صبر کرنیوالوں کے ساتھ ہے۔

تونگر پر شکر بھی واجب ہے......

لئن شکرتم لازیدنکم۔

ترجمہ: اگر تم نے شکر کیا تو تم کو اور زیادہ دوں گا۔

یعنی اس کے دیے ہوئے مال میں سے اس کی راہ پر خرچ کریں۔ کسی کی مدد نہیں کر سکتے تو اس کی غربت کا مذاق اڑا کر نفسیاتی مریض مت بنائیں تاکہ وہ اپنی مدد آپ کے تحت بھی کچھ کرنے کے قابل نہ رہے۔ اے اللہ! ہمیں صراطِ مستقیم دکھا بے شک تیری مدد کے بغیر ہم کچھ نہیں...... کچھ بھی نہیں۔

22 دسمبر 2018ء

جہیز

کچھ الفاظ اور جملے اس طرح زبان زدِ خاص و عام ہو جاتے ہیں کہ ہماری آدھی لائن بولنے پر سامنے والا مکمل کر دیتا ہے جبکہ زیادہ تر لوگ ان کا مطلب تک نہیں جانتے۔ اس کی گہرائی میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ بعض تعلیم یافتہ بھی وضاحت نہیں کر سکتے۔ معنی جاننے کے باوجود وضاحت کرنے کے بجائے گول کر دیتے ہیں جیسا کہ جہیز۔ کسی سے پوچھ لیں تو ایک ہی جواب ملے گا کہ ''جہیز لعنت ہے''۔ زبانی جمع خرچ کرنے والوں کے لیے کہنا آسان ہوتا ہے مگر عمل کہیں نظر نہیں آتا بلکہ کچھ سفاک طبیعت کے مالک باقاعدہ ڈیمانڈ کرتے ہیں کہ آپ کی اپنی عزت بڑھے گی ورنہ ہمیں مال و متاع کی کوئی کمی نہیں۔ ہر کام کی ابتدا کسی نقطہ سے ہوتی ہے۔ اس کی تاریخ کو دیکھا جائے تو ہندو کلچر میں ملتی ہے کیونکہ اس میں وراثت کا قانون نہیں۔ لڑکی کو جو کچھ دینا ہوتا ہے، وہ شادی کے وقت دے دیا جاتا ہے۔ اسی لیے جب رخصتی کے لیے لڑکے والے جاتے تو اپنے ساتھ سامان اٹھوانے اور اگر دور دراز میں جانا ہوتا تو راہزنوں سے حفاظت کے لیے لوگوں کی کثیر تعداد لے جاتے جو اسلحہ سے لیس بھی ہوتے۔ اس جتھے کو بارات کا نام دیا جاتا تھا ورنہ اسلام میں بارات کا کوئی تصور نہیں جس کو ولیمہ سے بھی زیادہ اہمیت دی جانے لگی ہے۔ کچھ بخیل بارات پر ہی عزیز و اقارب کو مدعو کر لیتے ہیں تا کہ ولیمہ کا خرچ بھی بچ جائے۔ یہ ذمہ داری بھی لڑکی والوں کے ناتواں کندھوں پر ڈالی جائے۔ برصغیر کے مسلمان چونکہ ہندوؤں کے ساتھ ہی رہتے تھے، اس لیے اسلام قبول کر لینے کے باوجود ان میں کچھ چیزیں جوں کی توں رہیں۔ ایسا نہیں کہ مبلغین نے ان کے نقصانات سے آگاہ نہیں کیا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں پر علاقائی کلچر کا رنگ غالب آتا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام نے بیٹی کو وراثت میں حصہ دار بنایا اور ہندو جہیز دے کر فارغ ہو جاتے تھے۔

سرمایہ داروں کو وراثت بچانے کے لیے ہندوانہ رسم پسند آئی۔ ان کا یہ فائدہ غریب کے گلے کا

پھندہ بن گیا کیونکہ وراثت جس کے پاس ہوتی، اسی کو دینا پڑتی۔ اس طرح کسی مفلس پر بوجھ نہیں پڑتا تھا۔ اسلام آسانیاں پیدا کرتا ہے لیکن انسان کی ذاتِ شریف نے آزادی کو ٹھکرا کر رسموں کی دَلدل میں اترنے کے شوق میں سر سے پاؤں تک دھنسنا پسند فرمایا۔ اس نے اللہ کے احکامات کو بھلا کر دنیاوی رواجوں کو اہمیت دی۔ اسلام دکھاوے کی عبادت قبول نہیں کرتا، پھر اس دکھاوے کو کیسے پسند کرے گا؟ اور تو اور...... کچھ دیندار ''جہیز پیکیج'' کے نام پر سیاست بھی چمکاتے ہیں کہ کسی غریب کی بیٹی کو جہیز دے کر نیکی کی جائے۔ یہ کیسی نیکی ہے جس کو لعنت بھی کہتے ہیں؟ اور اس کی حوصلہ افزائی بھی، کیا یہ دہرا معیار نہیں؟ تبلیغ کا مطلب لوگوں کو قرآنِ پاک کی طرف لانا ہے جبکہ یہ عمل اس کے الٹ ہے۔ جب لوگ نہیں سمجھتے تو کیا ان کے سامنے ڈھیلا پڑ جانا چاہئے؟ ایک طرف یہ فریضہ ادا ہو رہا ہے اور دوسری طرف بوجھ کو رواج دیا جا رہا ہے۔ جس گھر میں لڑکی نے جانا ہے، وہاں ایک انسان کے لیے سامانِ زندگی نہیں ہوتا۔ دس بارہ مہمان آجائیں، ان کے لیے آسانی سے انتظام ہو جاتا ہے اور ایک لڑکی کی اتنی ضروریات ہوتی ہیں کہ جب تک گھر بھرا ہوا نہ ہو، وہ نہیں رہ سکتی۔ افسوس کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی پہلی قوموں سے اس طرح مخاطب ہوئے اور وہی احکام ہمارے لیے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

> ترجمہ: ''حکم کرتا ان کو ساتھ بھلائی کے اور منع کرتا ہے ان کو نامعقول چیزوں سے اور حلال کرتا ہے۔ واسطے ان کے پاکیزہ چیزیں اور حرام کرتا ہے۔ اوپر ان کے ناپاک چیزیں اور اتار رکھتا ہے۔ ان سے بوجھ ان کے اور طوق جو تھے اوپر ان کے۔''
>
> (سورۃ الاعراف۔ آیت: 15)

جہیز کو ہوا دینے والا گروہ اچھا خاصہ کما لیتا ہے۔ ایک تو خود بھی راہِ راست سے بھٹکتے ہیں، دوسرا اپنی حرکتوں پر پردہ ڈالنے کے لیے ایک عظیم ہستی کی مثال پیش کرتے ہیں کہ حضرت فاطمہؓ کو بھی جہیز دیا گیا، چاہے وہ ایک مشکیزہ، چکی، کوزہ، مصلا، تکیہ اور گدا ہی تھا۔ ان کی کم علمی پر افسوس ہے کہ حضرت فاطمہؓ اور مولا علیؓ دونوں کے سرپرست ہونے کی وجہ سے دونوں کی ذمہ داریاں آپ ﷺ کی تھیں۔ حضرت علیؓ کے پاس اپنا گھر بھی نہیں تھا، اس لیے اب ایک نیا گھر بسانا تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ لکھتے ہیں کہ آپ ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ حضرت فاطمہؓ کو مہر دینے

کے لیے آپ کے پاس کیا ہے؟ تو جواب ملا کہ ایک ذرہ کے علاوہ میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ جس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا کہ اس کو بیچ کر مہر ادا کر دیں۔ اس وقت حضرت عثمانؓ نے تیس درہم یا دینار میں خرید لی اور بعد میں تحفہ کے طور پر یہ ذرہ واپس کر دی۔ اس مہر کی رقم سے گھر کا کچھ ضروری سامان خریدا گیا۔ اس کو بیساکھی بنا کر غریب پر بیٹی کو بھاری بھر کم بوجھ بنا دیا گیا۔ آج کا غریب بھی اسلامی تعلیمات سے نظریں چرا کر دنیاوی چکروں میں بخوشی پڑ گیا ہے۔ وہ اس مقابلے کی دوڑ میں پیچھے رہنا نہیں چاہتا۔ یہ تمغہ وہ ضرور اپنے نام کرنا پسند کرے گا، چاہے اس کے لیے کسی امیر مالک کا گلا کاٹ کر دولت ہتھیانا پڑے یا اپنی گردن گروی رکھ کر......اور اگر موقع ملے تو اپنی اوقات کے مطابق کرپشن میں جوہر دکھانے کا ارادہ کرے گا۔ فیصلے کی پختگی کے مطابق دریچے کھلتے چلے جائیں گے۔ ظلمت کی سلطنت میں بادشاہوں کی طرح رہنا پسند ہے لیکن مسلمانوں کی سی سادگی اپنا کر صراطِ مستقیم پر چلنے سے ان کی عزت کی چادر داغدار ہوتی ہے۔ رشتہ طے کرتے وقت ان کی بھی شرط یہی ہوتی ہے کہ لوگ امیر ہوں، چاہے جتنا جہیز مانگیں، دیں گے۔ اس طرح کے لوگوں کو ملتے بھی اپنے جیسے ہیں۔ جب کوئی زوال کا دریچہ کھلتا ہے تو سب تنکوں کی طرح اڑ جاتے ہیں۔ اپنے اردگرد جمِ غفیر پانے والے تنہائی کا شکار ہوں، تب یقین آتا ہے کہ سارا کمال پیسے کا تھا۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ برے وقت میں سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ میں تو یہی کہوں گی:

مصیبت کی گھڑی میں سب جہاں میں چھوڑ جاتے ہیں
شجر کو جس طرح پتے خزاں میں چھوڑ جاتے ہیں

27 دسمبر 2018ء

معاشرہ میں غیر اسلامی رجحانات!

آٹھ سالہ بچے کی موت کی سنسنی خیز خبر سن کر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ خبر کے مطابق یہ بچہ گھر کے صحن میں کھڑا تھا کہ اچانک اندھی گولی کا نشانہ بن گیا اور یہ گولی کہیں دور سے نہیں، بلکہ سامنے والے گھر میں شادی کی تقریب پر کی جانے والی ہوائی فائرنگ سے آئی تھی۔ بارات دلہن کو لینے چلی گئی لیکن ہمسائے میں ایک جنازہ دے گئی۔ خوشیوں کو لوٹ کر آنسوؤں اور غموں کی گھٹا دے گئی۔ آخر شادی کے موقع پر گولیاں برسانا ہماری تہذیب میں کہاں سے آ گیا؟ اس کا اسلامی احکامات سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ اسلام میں صرف نکاح اور ولیمہ شادی کے لوازمات ہیں۔ ایسا نہیں کہ یہ احساس کسی اور کو نہیں ہوا ہو گا، اکثر لوگوں نے قلم کی تلوار سے اس کا قلع قمع کرنے کا سوچا ہو گا اور اخبارات میں کالم بھی لکھے گئے ہوں گے کہ یہ فرسودہ رسومات جان لیوا ثابت ہوتی ہیں۔ پھر یہ کہ بارات میں فائرنگ ضروری کیوں؟ اس سے خوشی میں کتنا اضافہ ہو سکتا ہے؟ کتنے لوگ جان کی بازی ہار جاتے ہیں۔ زندگی کی شادابیوں میں اس طرح کی احمقانہ امنگیں معمول کا حصہ بن کر ثقافت کے نام پر پرورش پا رہی ہیں۔ گہرے احساس کے حامل لوگوں میں ان کے خلاف کوئی جذبہ بیدار ہو بھی جائے تو زمانے کے تلخ لہجے ان کو دبانے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں کہ خوشی کے موقع پر ایسا ہو بھی جاتا ہے۔ چونکہ یہ المیہ پورے معاشرے کا ہے اس لیے دوسروں کو صراطِ مستقیم پر لانے کے لیے ہمیں خود بھی وہی راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ ہم اس کیلئے آواز بھی نہیں اٹھاتے۔ بلکہ بعض اوقات تو اعتدال کی حدیں عبور کر جاتے ہیں اور سارا ملبہ اٹھا کر ابلیس کے سر پر ڈال دیتے ہیں۔ غم اور خوشی دونوں میں اپنی ذات وجذبات پر مکمل کنٹرول اللہ کو پسند ہے لیکن جب انسان اسلام سے کنارہ کشی اختیار کر کے عیش وعشرت کے ذائقے چکھے، تو یہ ذائقے اس کی طبیعت کا حصہ بن کر سماجی شعور کو کچل دیتے ہیں۔ سلیم الطبع سے اگر کچھ ایسا سرزد ہو جائے تو وہ فوراً بلند خیالی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کفارہ ادا کرنے کا سوچے گا لیکن انا کے کھٹمل اس

قدر پروان چڑھ چکے ہیں کہ دوسروں کا خون چوستے ہوئے احساس تک نہیں ہوتا۔ ان میں سے ایک بارات بھی ہے۔ مجبوری کا یہ وہ کوڑا ہے جس کو ہم بڑے شوق سے کھاتے ہیں بلکہ طاقت کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں کہ کتنی ہمت ہے۔ اگر تاریخ کے اوراق الٹا کر اسلامی ثقافت میں جا کر دیکھیں تو بارات کا نام ونشان بھی نہیں ملے گا۔ پھر یہ کہاں سے ہم نے اپنے گلے میں پھندا ڈالا؟

وہی برصغیر میں ہندوانہ مکسچر...... جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ہندوؤں میں وراثت کا قانون اسلامی قوانین سے مختلف ہے۔ بیٹی کو جو کچھ دینا ہو، وہ شادی کے موقع پر دے دیا جاتا، پھر اس سامان کو اٹھانے کے لیے لوگ ساتھ لائے جاتے، رہزنوں سے حفاظت کے لیے کچھ مسلح افراد کا جتھا ساتھ رکھنا ضروری ہوگیا، جو اپنے وقت کے ہتھیاروں کی نمائش کرتے، جب جدید اسلحہ آیا، پھر فائرنگ شروع ہوگئی کہ ہم خالی ہاتھ نہیں ہیں۔ باراتی سج دھج کر جاتے اور لڑکی والوں سے خوب خدمتیں کرواتے۔ دعوتیں اڑاتے میزبان بھی اس میزبانی پر فخر محسوس کرتے جبکہ اس کے برعکس اسلام میں نکاح اور ولیمہ دو احکام ہیں اور دونوں دلہا کی طرف سے ادا کیے جاتے ہیں لیکن ہم کیا کرتے ہیں، نکاح کے چھوہارے اور لڈو لڑکے کی طرف سے بانٹ کر مسلمان ہونے کا ثبوت دیتے ہیں، بارات کی دعوت ہندوؤں سے لے لی کیونکہ اس میں اپنا فائدہ تھا جبکہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ تقاضا کرتا ہے کہ پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ...... یعنی اس کے اقوال، جلال اور جمال ہر طرف نظر آئیں۔ یہ دنیا مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں۔ اگر ہوتی تو شاید کافر کو ایک بوند پانی بھی نہ ملتا۔ پھر اس کا ہوس ہمارے دلوں میں کیوں؟ حقیقت یہ کہ ہم اپنی اسلامی روایات کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے دولت اور روایات کا مذہب اپناتے ہیں۔ ایمان کا تقاضا تو یہ ہے کہ دنیا کی دولت دیکھ کر قلب میں سرسراہٹ سی بھی نہ ہونے پائے۔ اگر سوچیں یہ کتنا خوش نصیب ہے تو احساس کی مضبوطی کے مطابق اس کا ایمان کمزور ہے کیونکہ ہماری سوچ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم سے مطابقت نہیں رکھتی اور یہی مسلمانوں کے زوال کا سبب ہے۔

شاعرِ مشرق ڈاکٹر محمد اقبالؒ اپنی کتاب ضربِ کلیم میں نظم "مسلمان کا زوال" میں کچھ یوں مخاطب ہیں:

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا نہیں
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے تونگری سے نہیں

فراز سے نشیب کا سفر ہماری انہی حرکتوں کی وجہ سے ہے۔ جہاں دل آمادہ ہو گیا، اسے اسلام کا حصہ بنا دیا اور جو مشکل لگا وہاں عذر پیش کر دیا۔ اصل میں ہم نے سرشت کو آزادی دے دی۔ یہی سبب ہے، ورنہ دولت سے نہ عزت ملتی ہے نہ سکون، جب تک اس میں خیر نہ ہو۔ کچھ امور ایسے بھی ہیں جن کا تعلق اسلامی احکامات سے نہیں بلکہ روایات سے ہے۔ انہیں ہم بڑے فخر سے بتاتے اور دکھاتے ہیں۔ ایسے وقت میں ہمارا مطمحِ نظر صرف دنیا ہوتی ہے، دین سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اب چونکہ بارات پر ہی بات چل رہی ہے، اسی کو دیکھ لیتے ہیں کہ اسلامی تقریبات میں ہم نے کتنی لغویات شامل کر لی ہیں۔ شادی کی رسوم میں قیمتی ملبوسات اور زیورات سے سجی سنوری نازک اندام دوشیزائیں رقص و سرور میں اس طرح مصروف ہوتی ہیں کہ دیکھ کر لگتا ہے کہ پوری برادری کا واحد نصب العین گانا اور ناچنا ہے۔ ان کے قدموں کی دھول محرم حضرات کی آنکھوں میں پڑ کر کچھ وقت کے لیے بصارت پر پردہ ڈال دیتی ہے اور باقی مجمع میں بجلی کا سا جوش و خروش پیدا ہو جاتا ہے۔ ڈھول بجانے والا ازل سے جیسے ان کا اپنا تھا جس کو مرکز مان کر پروانوں کی طرح اس شمع کے گرد چکر لگائے جاتے ہیں۔ اس کی نظریں جہاں بھی پڑیں اجازت ہے۔ کیا یہ فرض ادا ہو رہا ہے؟ اس تھکا دینے والے پروگرام میں نکاح کے علاوہ کوئی اسلامی رسم نظر نہیں آتی۔

اس کے علاوہ بے شمار ایسی رسومات ہیں جن کا اسلام سے کوئی ناطہ نہیں بلکہ وہ ہندوانہ ثقافت کا پیش خیمہ ہیں۔ جیسے منڈھا باندھنا، چھوہارے کھلانا، دلہن کے ہاتھ پر کھیر رکھ کر دلہا کو کھلانا، آرسی مصحف، دلہا کا دلہن کو اٹھا کر گھر کے اندر لے جانا وغیرہ...... اور ایسی بے شمار دیگر رسوم ہیں جن کی اسلام اجازت نہیں دیتا بلکہ سختی سے منع کرتا ہے۔

ان مسلط کردہ غیر اسلامی رسوم نے شادی بیاہ کو غریب افراد کے لیے مشکل سے مشکل ترین بنا دیا ہے۔ وقت کی کوئی اہمیت نہیں۔ پاکستانی قوم کے پاس سب سے زیادہ ضائع کرنے کے لیے وقت ہی ہے جو انمول ہے۔ کوئی کتنا ہی امیر ہو جائے، اپنی زندگی میں ایک پل کا اضافہ نہیں کر سکتا۔ یہ وہ نعمت ہے جس کی قدر ہی نہیں کی جاتی۔ دنیا و آخرت دونوں بچانی ہیں تو آج سے عہد کرنا ہو گا کہ ہم دنیا سے نہیں ڈریں گے۔ زمانہ کیا کہتا ہے، کہنے دیں، ہم نے وہ کرنا اور کر کے دکھانا ہے

جو ہمارا دین کہتا ہے کیونکہ اسی میں آسانیاں ہیں۔دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کریں، مشکلات نہیں۔وہ راستہ اختیار کرنا ہے جو نہ صرف ہمارے لیے آسان ہو بلکہ ہمارے پیچھے آنے والوں کو منزل تک پہنچنے میں دشواریوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مشعلِ راہ بننا ہے۔درست راستے کا انتخاب کرنا ہے۔ چاہے ہم سفر تنہائی ہو۔جن پر مذہب کی گرفت کمزور نہیں پڑتی، ان کی روح قدیمی اسلامی روایات اور اقدار کے جادہ سے ذرہ بھی نہیں بھٹکتی۔ایسے لوگوں کو فرطِ حیرت سے دیکھا جاتا ہے کہ یہ کون سی خلائی مخلوق ہے۔زمانے کی ہوا سے ڈر کر ہم پلٹنے والے نہیں۔اپنے آپ سے عہدِ پختہ کریں۔اللہ کی مدد ہمیشہ ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو اس سے مدد مانگتے ہیں۔

ترجمہ: ''اے زندہ اور اے قائم رہنے والے تیری رحمت کے سبب سے فریاد کرتا ہوں کہ میرے سب کاموں کی اصلاح فرمادے اور پلک جھپکنے کے لیے بھی مجھے میرے نفس کے حوالے نہ کر۔''

آمین،ثم آمین۔

28اپریل2019ء

جُہدِ مسلسل

زندگی کے نشیب و فراز میں ایسے موڑ بھی آتے ہیں۔ جب راستے کا انتخاب مشکل ہو جاتا ہے۔ انسان فطری طور پر جلد باز ہونے کی وجہ سے ہمیشہ عقل سے زیادہ ظاہری آنکھ کا استعمال آسان سمجھتے ہوئے اسی سے رہنمائی لیتا ہے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی، پھر بھی وہ اپنے آس پاس کے لوگوں میں سے جن کی پیروی کرتے ہیں، ان کی پسِ پشت کہانی سے ناواقف ہوتے ہیں کیونکہ کچھ لوگ اپنی ذات کو تہہ بہ تہہ چھپانے کا گر جانتے ہیں۔ انہوں نے خود سے یہ عزم کر رکھا ہوتا ہے کہ وہ اپنی تکلیف، کسمپرسی اور بے بسی زمانے پر عیاں کر کے اللہ کی ناشکری نہیں کریں گے اور ہر حال میں اس ذاتِ بابرکات کا شکر بجا لائیں گے۔ ان کا مقصدِ حیات خوشیاں بکھیرنا ہے نہ کہ افسردگی۔ انہیں دیکھنے والے تصویر کا ایک رخ دیکھ کر ان کی خوش بختی پر رشک کرتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ایک جہدِ مسلسل کے بعد یہ مقام و مرتبہ ملا ہے۔ آج میں جس ہستی کا ذکر کر رہی ہوں، اسے آسمانِ ادب و صحافت کی قوسِ قزح کے رنگوں میں سے ایک رنگ کہا جا سکتا ہے اور جو کسی تعارف کا محتاج نہیں، سید غضنفر کاظمی۔ سید غضنفر کاظمی راقم الحروف کو اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ اس طرح بتاتے ہیں کہ وہ 29 اکتوبر 1946ء میں انبالہ میں پیدا ہوئے۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد ان کے والدین اپنا تمام تر کاروبار (بجلی کا کارخانہ، باغات اور ایک عدد کنواں) انبالہ میں چھوڑ کر پاکستان آ گئے۔ کچھ عرصہ جہلم میں رہنے کے بعد لاہور میں کاروبار شروع کیا۔ پاکستان میں پہلی بار ''ریلے'' سائیکل متعارف کروائی مگر والد کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ بہت جلد اس دارِ فانی سے رخصت ہو کر خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ والد کی بے وقت موت کی وجہ سے میٹرک میں تعلیم کو وقتی طور پر چھوڑ کر چپڑاس کی ملازمت اختیار کر لی لیکن کسی منزل کو کبھی آخری نہیں سمجھا بلکہ مسلسل جدوجہد جاری رکھی۔ آگے بڑھنے کے جوش نے کہیں رکنے نہیں دیا۔ سیلز مین سے لے کر فلم میں ایکسٹرا کے طور پر کام کرتے ہوئے سفر جاری رکھا

اور تعلیم کا سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا، بحال کیا۔ زندگی کے اس کٹھن سفر میں مشکلات اور رکاوٹوں کی کبھی پروانہ کی۔ رستے میں جا بجا سپیڈ بریکر، کئی کہسار آئے مگر ارادوں کو کمزور نہ کر پائے۔ اس طرح دہری ترقی کرتے کرتے ایک روز اس مقام پر پہنچ گئے کہ ایرانی قونصلیٹ میں آفیسر تعلقاتِ عامہ کے طور پر کام شروع کیا۔ پھر خانۂ فرہنگ میں کافی عرصہ تعینات رہے۔ یہاں کام کرنے کے بعد روزنامہ ''جرات'' کو جوائن کر لیا۔ اسی دوران روزنامہ ''دن'' میں بھی بطور ایڈیٹوریل اسسٹنٹ کام کرتے رہے۔ وہاں سے چھوڑنے کے بعد روزنامہ ''جرأت'' کے مالک اور چیف ایڈیٹر جمیل اطہر قاضی کے ساتھ آج تک کام کر رہے ہیں۔

کاظمی صاحب کی زندگی میں مختلف رنگ ہیں جن کا گراف عجیب وغریب ہے۔ کبھی پاتال میں گر گئے، کبھی اوجِ ثریا پر پہنچے، اسی اتار چڑھاؤ میں زندگی گزرتی گئی۔ زندگی کے ان ایام میں سانس کے مریض ہیں جس کی وجہ سے آکسیجن کا سلنڈر لگا رہتا ہے۔ اس کے باوجود ابھی تک روزنامہ ''جرات'' میں کام کر رہے ہیں۔ روزانہ کا اداریہ لکھ رہے ہیں۔ جمیل صاحب کی شفیق طبیعت کا یہ عالم ہے کہ وہ پوری تنخواہ دے رہے ہیں جس سے اپنی زندگی کی گاڑی چلا رہے ہیں۔ ان حالات میں بھی کسی پر بوجھ نہیں۔ یہ ان لوگوں کے منہ پر زوردار طمانچہ ہے جو اپنی بیماریوں کو معذوری کا نام دے کر مفلوج کہلوانا پسند کرتے ہیں۔ ایسے لوگ نہ صرف دوسروں کے کندھوں پر بلکہ دھرتی پر بھی بوجھ بن جاتے ہیں۔ یہاں ہمارے لیے سبق آموز بات ہے کہ ہم کسی کی زندگی کی تصویر کا ایک رخ دیکھ کر اس کی باقی داستان اپنی مرضی سے لکھ لیتے ہیں جبکہ چھ کے ہندسہ کو الٹا کیا جائے تو 9 نظر آتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بے شمار نعمتوں سے نوازا، جن میں سب سے بڑی عقل وشعور ہے جس کی وجہ سے انسان باقی مخلوقات سے افضل ہے اور شاید یہی چیز ہے جس نے ان کو آج تک شدید بیماری کے باوجود زمانے کی نظروں میں گرنے نہیں دیا۔ وہ اداریہ کے ساتھ ساتھ ادبی خدمات بھی سرانجام دے رہے ہیں۔ اپنی زندگی کی داستان خود لکھ رہیں جس میں کمزوریٔ یادداشت کی وجہ سے بہت سے واقعات ذہن سے محو ہو چکے ہیں مگر پھر بھی اپنے محسنوں کو نہیں بھولے۔ جس موڑ پر بھی کسی نے احسان کیا، اگر بدلہ نہ چکا سکے تو یاد ضرور رکھا۔ جس کو اپنی زندگی کی ادھوری داستان اور رنگین وسنگین کہانی کہتے ہیں، میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ وہ ان لوگوں کو بتانا

چاہتے ہیں کہ میں تمہیں کبھی نہیں بھولا۔ یہ بھی بدلہ چکانے کا ایک طریقہ ہے۔ جن پر اللہ کا فضل ہو جائے، وہ ہر حال میں اس کا شکر ادا کرتے ہیں۔ وہ دنیاوی مشکلات میں گھبراتے نہیں بلکہ امتحان الٰہی سمجھتے ہیں اور پاس ہونے کی صورت میں بلند و بالا مرتبہ ملنے کا یقین رکھتے ہیں کیونکہ ذاتِ بابرکات کسی کا احسان نہیں رکھتی۔ اس کے لیے ظاہر سے زیادہ باطن معنی رکھتا ہے۔ جس کا باطن اچھا ہو، اس پر اپنا کرم بے شمار کرتا ہے۔

کرم ہے کیا؟

یہ بھی کچھ کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ اس کا کوئی خاص فارمولا نہیں۔ ہاں! البتہ یہ ان کو عاجزی کی طرف لے جاتا ہے۔ سب کچھ ہونے کے باوجود اللہ کو منانے کا اضطراب بے چین رکھتا ہے۔ ہر وقت ان کا دھیان اسی بات کی طرف ہوتا ہے کہ کوئی اللہ کا قرب حاصل کرنے کا طریقہ مل جائے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ انسان کے دل میں رہتا ہے، اس لیے کسی انسان کے دل پر کبھی بھولے سے بھی ضرب نہیں لگاتے۔ اگر انجانے میں لگ بھی جائے تو معذرت کے لیے تیار رہتے ہیں......اور یہ خوبی غضنفر کاظمی صاحب میں کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس طویل بیماری کی وجہ سے کچھ کام وقت پر سرانجام دینا تو بھول سکتے ہیں مگر معذرت کرنا نہیں بھولتے۔

اللہ تعالیٰ سے یہی دعا ہے کہ انہیں صحتِ کاملہ عطا فرمائے۔ جو کچھ وہ اپنی زندگی کی داستان میں کہنا اور سبق ہمیں دینا چاہتے ہیں، وہ سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اگر کسی پر ایسا وقت آجائے تو صبر کے ساتھ اس کا شکر ادا کرنے کا کلیہ اپنانا چاہیے نہ کہ واویلہ۔ مخلوق کے سامنے خالق کا شکوہ زیب نہیں دیتا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہر حال میں شکر ادا کرنے والا بنائے۔ آمین ثم آمین۔

25جون 2019ء

اِضطراب

مالک کونین نے تمام مخلوقات کی تخلیق کے وقت ان کی ضروریات کو فطرت میں شامل کر کے ذات کا حصہ بنا دیا۔ یہ ذمہ داری اب مخلوق پر عائد ہوتی ہے کہ وہ خداداد صلاحیتوں کی کھوج لگا کر مفید نتائج حاصل کرے۔ اس کی بے شمار نعمتوں میں سے دماغ بھی ایک نعمت ہے جس کی مثال کان کی سی ہے۔ ہر وقت سوچتے رہنا کچھ لوگوں کی فطرت کا خاصہ ہوتا ہے۔ ان کے دماغ میں ایک اضطرابی کیفیت رہتی ہے۔ کچھ ذہنی صلاحیتیں مشترک ہوتی ہیں۔ جیسے آس پاس کے بارے میں غور و فکر کرنا۔ ان دماغی وظائف کو پرکھنے کے لیے کوئی خاص کسوٹی نہیں لیکن یہ بات بھی یقینی ہے کہ ہر انسان غور و خوض اپنی عقل و شعور کے مطابق کرتا ہے۔ ذہن ایک پیچیدہ مشینری کی طرح ہے جس کو حرکت میں لانا آسان سے آسان اور مشکل سے مشکل ہے۔ جو لوگ اس سے کام لینا جانتے ہیں، جب وہ سوچنے لگیں تو خیالوں کا سیلاب طوفانِ نوح کی طرح اُمڈ آتا ہے۔ اس فن سے عاری لوگ اسے کام میں نہیں لا سکتے تو یہ اضطراب ہیجان میں بدل کر ذہنی نزاع پیدا کرتا ہے جس سے جسمانی اور ذہنی عدمِ مطابقت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ عدم توازن بے ضابطگی کی بنیاد بن کر تفکر میں خلل پیدا کرتا ہے اور مزاجِ انسانی کے تغیر کا سبب بنتا ہے۔ ایک دفعہ کسی نے اپنی جسمانی، ذہنی اور قلبی کیفیت کو کچھ اس طرح بیان کیا کہ ہر وقت کوئی پریشانی سی رہتی ہے جس کی وجہ سمجھ سے باہر ہے۔ کوئی قرآنی وظیفہ بتایا جائے۔ پوچھنے والے انسان کو جس حد تک میں جانتی تھی، باقاعدگی سے نماز ادا کرنے والے اور تلاوتِ قرآنِ پاک کرنے والے تھے۔ پھر بھی سورۃ الفرقان کی آیت 74 کا ورد بتا دیا اور ساتھ اپنی قرآنِ پاک کی ابتدائی گرامر کلاس میں شمولیت کی خواہش ظاہر کی جسے انہوں نے خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ کچھ دنوں کے بعد انہوں نے بتایا کہ جب سے میں نے قرآن گرامر کی کلاس شروع کی ہے، میری پریشانی کچھ کم ہونے لگی ہے۔ کوئی بوجھ سا جیسے ذہن سے اترنے لگا ہو۔ بے شک اللہ کے کلام میں شفا ہی شفا ہے، لیکن یہ معمول پہلے

کا ہے، صرف تلاوت کے وقت قرآن کو سمجھ کر پڑھنا شروع کیا، وجہ تغیر میری ناقص عقل سے باہر ہے۔

اس کی ایک بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ تلاوتِ قرآنِ پاک کے وقت ہماری زبان حرکت میں آتی ہے۔ بے شک اس کا اثر دل پر ضرور ہوتا ہے لیکن اس کی حکمت کو ہم سمجھ نہیں سکتے۔ ذہن فارغ رہتا ہے جبکہ سمجھ کر پڑھنا اور اس پر غور وفکر کرنا انسان کو صاحبِ نظر بنا دیتا ہے۔ دل کو بینائی عطا کر کے، کائنات کے اسرار و رموز سے پردہ اٹھا کر، حقیقت کو کھول کر، نئی نئی ایجادات اور تسخیرِ کائنات کی راہیں دریافت کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اس کی تعلیم نہ صرف آخری زندگی بلکہ دنیاوی ہر شعبۂ حیات میں مکمل رہنمائی کر کے کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے۔ اسی کے ذریعے انسان خود کو پہچان سکتا ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

من عرف نفسه فقد عرف ربه۔

ترجمہ: ''جس نے خود کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔''

بانئ دوجہاں تک رسائی کے بعد کسی عارضی سہارے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہی تعلیم اپنی امت کو دی۔ اس کے بعد انسان اپنے آپ کو کبھی تنہا محسوس نہیں کرتا۔ ایسے افراد مل کر جب قوم بنتی ہے، تبھی روئے زمین پر انقلاب آتے ہیں۔ اپنے جیسے انسانوں کے بنائے اصول وقوانین، ضوابط و آئین چھوڑ کر اللہ کے نافذ کردہ قانون کو آخری فیصلہ مان کر اس کی تقلید کرتے ہیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ اس میں ترمیم کی گنجائش نہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر سکون کا آنا لازمی ہو جاتا ہے۔ اچھائی اور برائی کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے تو کون گمراہی میں رہتا ہے؟ اس راہ پر قدم رکھتے ہی سوچ کے دہانے کھل کر ضعیف العقل انسان کے بھی عقائد پختہ ہو جاتے ہیں۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ حکمت والی کتاب ہے۔ اس سے استفادہ کرنے والے صحرانشینی، جہالت اور ظلمت کے اندھیروں سے نکل کر روشنی، علوم وفنون کا سرچشمہ بن کر پورے عالم میں چھا گئے۔ کلامِ الٰہی کے ایک ایک حرف میں بے شمار حکمتیں اور راز پوشیدہ ہیں۔

دورِ جدید کی ٹیکنالوجی کے جنگل میں انسان کہیں کھو سا گیا ہے۔ اس الجھی ہوئی شخصیت کو یکجا کرنے کے لیے پہلے سے بھی زیادہ قرآنِ پاک کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے۔ اس

بابرکت نسخہ سے ہم شفا پائیں گے۔ کلام کی وسعت کا اندازہ لگاتا تو انسان مانتا ہے کہ اس کے بس میں نہیں، پر قرآن پاک کی ترتیب میں بھی کئی معجزے ہیں۔ کوئی اسے بدل نہیں سکتا۔ ایسی کاریگری سے گن گن کر اور چُن چُن کر حروف کلمے اور اسم کا استعمال کیا گیا ہے کہ بس انسان پکار اٹھتا ہے، ''اللہ اکبر! سبحان اللہ!''...... ایک ایک چیز کے دس دس نام ہیں۔ کہاں پر کون سا لگانا ہے؟ ازواج کہاں مناسب رہے گا؟ امرات کہاں فٹ آئے گا؟ صاحبہ کس کے لیے ہے؟ یہ اس کی حکمتیں ہیں۔ صرف اس حسنِ ترتیب کو دیکھ کر جہانِ فانی کی سوچیں کہیں دور بھاگ جاتی ہیں اور نئی جستجو شروع ہو جاتی ہے۔ ہمیں اس طرف توجہ دینا ہوگی۔ امام غزالیؒ کیمیائے سعادت میں توجہ کے باب میں کچھ اس طرح فرماتے ہیں کہ انسان کو سب سے پہلے اپنے وراثتی ایمان پر توجہ دینی چاہیے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اے ایمان والو! ایمان لاؤ، اللہ پر اور اس کے رسول ﷺ پر۔''

اگر چہ ہم پیدائشی ایمان والے یعنی مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے والے ہیں پھر بھی ہمیں ریسرچ کی ضرورت ہے۔ لیکن ہم لکیر کے فقیر بن کر رہ گئے ہیں۔ مجموعی طور پر سب میں یہ اہلیت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے باطن اور فطرت کی پکار کی روشنی میں گہرے غور و فکر، قول و فعل اور طرزِ زندگی میں نمونہ بن کر دکھائیں۔ معاشرے میں کچھ لوگوں کو قائد کا رول ادا کرنا پڑتا ہے۔ ماں کی گود پہلا گہوارہ ہے۔ راہِ ہدایت کی طرف آنے والا مرد علم کو گھر کی دہلیز پر لاتا ہے اور عورت اسے سو بندوں تک پہنچاتی ہے۔ ہم سب کو اپنے فہم کے مطابق اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ اپنا علاج ہم خود کر سکتے ہیں۔ پچھتر فیصد امراض ہمارے اپنے پیدا کردہ ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو ان سے بہ آسانی نجات حاصل کر سکتے ہیں۔

یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ ہم جب کسی ایسی کیفیت میں مبتلا ہوتے ہیں تو اکثر غفلت برتتے ہیں یا صرف دوا کرتے ہیں یا پھر دعا...... میرے خیال کے مطابق یہ طریقہ درست نہیں بلکہ دوا اور دعا دونوں کا بیک وقت استعمال ضروری ہے۔ نبی پاک ﷺ نے دونوں علاج ایک ساتھ کرنے کا حکم فرمایا۔ اس لیے کسی ایک کو اپنے لیے کافی نہ سمجھا جائے بلکہ دونوں طریقہ ہائے سنت ہیں۔

10 جولائی 2019ء

ٹیکسوں کا ناروا بوجھ

عصری حالات سے بے خبر رہ کر جب کوئی فنکار اپنا شاہکار تخلیق کرتا ہے تو کچھ ہی وقت میں کسی کچے مکان کو مسلسل بارشوں کی زد میں رہنے کے بعد کی صورت اختیار کر لیتا ہے کیونکہ انسان اکیلا کچھ نہیں۔ وہ جو بھی ہے، اپنے زمانے کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھ کر اپنے فن کا مظاہرہ کرے گا۔ اگر کوئی فن پارہ بنانا چاہے اور اس کے سامنے لوگ بھوک پیاس سے دم توڑ رہے ہوں تو ایسی صورتحال سے نظریں چرا کر بہاروں، پھولوں اور خوشیوں کا ذکر کیسے چھیڑا جا سکتا ہے؟ ہر فنکار اپنے دور کا پیامی ہوتا ہے۔ اپنے عہد کی ثقافت، سیاست، حالات اور واقعات کے چہرے سے نقاب ہٹا کر سب کو دکھانا اس کی ذمہ داری ہونے کے ساتھ فن پارے کی زندگی کی ضمانت بھی ہے۔ ان کے ذریعے اپنے اندر کی کرب آمیز سچائیوں کو بیان کر کے اپنے دور کو اس طرح زندہ رکھتا ہے کہ دیکھنے، پڑھنے اور سننے والے خود کو اسی زمانے میں پائیں۔ تاریخ کے جھرنے پھوٹ پھوٹ کر اپنے عہد کی محرومیوں کی فہرست سب کے سامنے رکھیں۔ دورِ حاضر میں وطنِ عزیز کو بہت چیلنجز کا سامنا ہے۔ اس وجہ سے کچھ فیصلے عوام کی امنگوں پر پانی ڈال دیتے ہیں جن میں سے ایک ٹیکس بھی ہے۔ آج کل ٹیکس کی کہانی سوشل میڈیا پر عروج حاصل کرنے کے بعد پرنٹ میڈیا، الیکٹرانک میڈیا اور سب سے تیز ترین، ہر جگہ کام کرنے والے، بغیر کسی چھٹی اور وقفہ کے سینہ بہ سینہ میڈیا سب پر برابر زیرِ بحث ہے۔ ٹیکس کی کہانی اس لیے کہ کچھ چیزوں پر ٹیکس عائد کیا گیا۔ باقی جن پر نہیں لگایا گیا، تاجر حضرات اور دکاندار وہ چیزیں بھی اپنی من مانی قیمت پر بیچنے کے لیے رونے والوں کے ساتھ آنسو بہا کر، حکومتِ وقت کو دو چار بڑے القابات دے کر، سو کی چیز دو سو میں دے رہے ہیں۔ یوں سمجھیں کہ گالیوں کے اچھے خاصے دام وصول کر رہے ہیں۔

بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ آئے روز ایک نئی کہانی سننے کو ملتی ہے۔ کبھی یہ افواہ کہ قبر پر ٹیکس لگنے والا ہے۔ اب بندہ سوچے کہ جب کوئی لاوارث مرے گا، اس کو دفن نہیں کیا جائے گا کہ اس کا

کوئی ٹیکس ادا کرنے والا نہیں، یا مرنے سے پہلے ادا کر کے مرے گا؟ سوچنے کی بات ہے۔کبھی نکاح پر ٹیکس۔ یہ ایک مذہبی فریضہ ہے اور ہر امیر غریب پر فرض ہے۔ایسی خبریں سن کر کون سکون سے رہے گا؟ اگر لگانا بھی ہے تو جہیز پر لگائیں۔اس کی مد میں صرف صاحبِ حیثیت لوگ آئیں گے اور دکھاوا ختم ہو جائے گا۔جس سے غریب کی گردن اس طوق سے آزاد ہو جائے گی اور فرسودہ رسم کا خاتمہ ہو گا۔اگر ٹیکس لگانا ہے تو تقریبات پر لگائیں۔ایک شادی کے پانچ پانچ فنکشن بنادیے گئے ہیں۔مہندی، مائیوں، بارات اور ولیمہ۔اس طرح ایک شادی پر ہزار بندے کا پورا ہفتہ ضائع ہوتا ہے اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ شادی ایک ہفتہ بھی نہیں چل سکتی۔حکومت کو ٹیکسوں کی ضرورت ہے کیونکہ کسی بھی ملک کے بجٹ کا دارومدار ٹیکسوں پر ہی ہوتا ہے اور ہم پر صرف حکومت چلانے کا خرچ ہی نہیں بلکہ سابقہ ادوار میں لئے گئے تیس ہزار ارب روپے کا سود بھی ادا کرنا ہے۔ لہٰذا ٹیکس عائد کرنا حکومتِ وقت کی مجبوری ہے لیکن اس امر کو ملحوظ ضرور رکھیں کہ عوام کا جینا مرنا مشکل نہ بنادیں۔ایسی چیزوں پر ٹیکس لگائیں جس سے غریب شہریوں پر کوئی بوجھ نہ پڑے اور برائی کی حوصلہ شکنی ہو، نہ کہ فرض کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرے۔کبھی کوئی ٹیکس، کبھی کوئی ٹیکس، بہتر ہوگا کہ جب تک حتمی فیصلہ نہیں کرلیا جاتا، اس وقت تک علان ہی نہ کیا جائے کیونکہ بازاروں میں چیزوں کی قیمتوں میں فوری طور پر اضافہ کر دیا جاتا ہے۔اعتراض کرنے والوں کو تاجر کہتے ہیں کہ حکومت سے پوچھیں جو ٹیکس پر ٹیکس لگائے چلی جارہی ہے۔کسی نے قبر کا ٹیکس ادا کیا؟ کسی نے نکاح کا ٹیکس ادا کیا؟ اس کا ایک آسان سا حل ہے کہ وقت سے پہلے بولنے والوں کی زبانوں پر اگر ٹیکس لگ جائے تو کئی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔اس بیروزگاری کے دور میں غریبوں کو خوفزدہ کر کے ان کے لیے کئی نئے مسائل تفکرات میں اضافہ کر دیتے ہیں۔جھوٹی خبریں پھیلانے پر ٹیکس ہونا چاہئے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:**لعنت اللہ علی الکذبین**۔ یعنی جھوٹوں پر اللہ کی لعنت۔اس طرح لوگ اس لعنت سے بھی بچ جائیں گے اور پریشانیوں سے بھی۔نئے موضوع پر سیاق وسباق کے اضافے کے ساتھ مسجع بنا کر ایسی باتیں پیش کی جاتی ہیں کہ بلی سے شروع ہونے والی بات دسویں انسان تک پہنچتے پہنچتے شیر بن چکا ہوتا ہے۔

یہ جاننے کے باوجود کہ اس میں دس فیصد سچائی ہوگی، پھر بھی لوگوں کی دلچسپی بڑھتی چلی جاتی ہے۔جن کا دور دراز تک حالاتِ حاضرہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، وہ بھی تبصرہ ضرور کریں گے۔اگر

دیکھا جائے تو یہ ایک مثبت تبدیلی ہے۔اس سے معاشرہ باشعور ہوتا ہے۔اپنے اردگرد کے حالات سے آگاہی انسان کو بندگی کی طرف لے جاتی ہے۔اپنے علاوہ دوسروں کے حالات پر نظر پڑتی ہے لیکن یہ نظر احساس کی حد تک رہے تو ٹھیک ہے ورنہ نظرِ بد بن کر دوسروں کی دنیا اور اپنی آخرت کی بربادی ہے۔ہمیں ملکی صورتِ حال پر بات کرتے ہوئے اپنے ذاتی مفادات کو پسِ پشت ڈال کر اجتماعی بہتری کی بات کرنی چاہیے۔

مذہبی منافرت، نسلی تعصبات اور طبقاتی تقسیم اولادِ آدم کے ذہنوں میں دراڑیں ڈالنے والے عوامل ہیں۔ایسا تب ہوتا ہے جب انسان اپنی فطری عظمت کو بھول کر گروہی سازشوں میں مبتلا ہو کر ذاتی تشہیر کی خاطر نمود و نمائش کرتا ہے۔یہ بیمار معاشرے کی علامات ہیں۔اس کا نقصان یہ ہے کہ سچ اور جھوٹ کی پہچان کرنا مشکل ہو جاتا ہے جس سے عوام میں غم و غصہ اور بغاوت کی وبا پھوٹنے کے خدشات بڑھ جاتے ہیں۔ظلم کے خلاف آواز اٹھانا حق ہے لیکن پہلے سچائی تک پہنچنا ضروری ہے۔حقیقت کو جاننے کے باوجود ظالم کا ساتھ دینا یا خاموشی سے برداشت کرنا ظلم میں برابر کی شرکت کا عمل ہے لیکن آپس کے فسادات تیسری طاقت کو مضبوط بناتے ہیں۔جس میں نقصان دونوں کا ہوتا ہے۔بالکل ایسے ہی جیسے محبت اور انا کی جنگ میں جیت ہمیشہ جدائی کی ہوتی ہے۔

یکم اگست 2019ء

معرکۂ لبِ فرات ہنوز جاری

نیوز چینل سے لے کر سوشل میڈیا تک آج کل ایک ہی خبر گردش کر رہی ہے ''صلاح الدین کی پولیس حراست میں موت یا قتل''......اس واردات میں سب اپنی اپنی حیثیت کے مطابق حصہ بھی ڈال رہے ہیں اور انصاف کی اپیل بھی جاری ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ کیا واقعی ہم انصاف چاہتے ہیں، یا محض رسم نبھار ہے ہیں؟ کچھ اس کو پاگل اور مظلوم ثابت کر کے پولیس کو گالی گلوچ اور حکومتِ وقت کو اس کا قصوروار ٹھہرا کر اپنا غم وغصہ نکال رہے ہیں۔ کچھ اس کی تردید کر کے ایک چالاک، مکار، چور اور اپنے دفاع کے لیے بازو پر نام، پتہ اور فون نمبر لکھوا کر باقاعدہ ایک منصوبے کے تحت اس کام کو سرانجام دینے والے سرغنہ ڈاکو کے خطاب سے نواز رہے ہیں۔ وہ پہلے گونگا بنا رہا اور بھرپور انداز میں ایک گونگے کی اداکاری کرتا رہا۔ پھر پولیس کے سامنے بول پڑا۔ چلیں ہم یہ مان لیتے ہیں کہ وہ مجرم تھا تو کیا وہ پیدائشی مجرم تھا؟ جب اس نے جرم شروع کیا، اس وقت کسی کو نظر نہیں آیا؟ وہ اس معاشرے کا حصہ تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت کس کی ذمہ داری تھی، صرف گھر والوں کی؟ اسے مجرم بنایا کس نے؟ کیا وجوہات تھیں؟ اگر وہ اے۔ ٹی۔ ایم مشین کھول کر چوری کرتے ہوا پکڑا گیا، تو کیا وہ اس زمانے میں، اس ملک میں اکیلا چور تھا؟ کیا اس طرح کا رویہ اس کے ساتھ برتنا جائز تھا جس سے انسانیت ہی شرما جائے؟ کبھی کسی سے پوچھا کہ وہ جرم کیوں کرتے ہیں؟ یہ ایک صلاح الدین کی موت نہیں ہوئی بلکہ اس طرح کے کئی صلاح الدین مرتے ہیں لیکن المیہ یہ ہے کہ ہم صرف سانس کے رکنے کو موت کہتے ہیں۔ کچھ چلتی پھرتی لاشیں بھی نظر آتی ہیں۔ ان کا کوئی احتجاج نہیں کرتا۔ اگر ہوتا تو آج صلاح الدین نہ مرتا۔ انصاف کے لیے سانس کا رکنا ضروری ہو گیا ہے اور جب آواز اٹھائی جاتی ہے تو ظالم کے خلاف جبکہ ظلم کے خلاف اٹھانی چاہئے۔ جب تک ظلم نہیں مرتا، ظالم پیدا ہوتے رہیں گے اور ظلم احتجاج سے نہیں، جہاد سے مرتا ہے۔ سب سے پہلا قدم جہاد بالنفس ہے۔ معصوم زینب کے ساتھ درندگی کرنے والا عمران اپنے

خلاف احتجاج میں شامل تھا جس نے سفا کی، جبر اور زیادتی کی انتہا کر دی تھی۔ اس کی پھانسی کی سزا سے کیا جرم رک گیا؟ نہیں، کیونکہ سب کو سزا نہیں ملتی۔

انصاف اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہر انسان اپنے گریباں میں نہیں جھانکتا۔ جہاں ہم دوسروں کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں، وہاں ہمیں اپنا بھی احتساب کر لینا چاہئے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں یہ کس زمرے میں آتا ہے۔ روزمرہ زندگی میں دیکھیں۔ ایک عمران کے مرنے سے بچوں کے ساتھ زیادتی ہونا بند ہوئی؟ بالکل نہیں۔ ہر مجرم کو عمران جیسی سزا کیوں نہیں دی گئی؟ اس پر قانون بننا چاہئے تھا، جس کا سب پر برابر اطلاق ہوتا، پھر یہ جرم رکتا۔ ایک انسان کے خلاف احتجاج کیا، اس کو پھانسی دی گئی، اگر برائی کے سامنے ڈٹ جائیں تو اسے بھی ختم کیا جاسکتا ہے۔ پر ایسا ہم کرتے نہیں۔ سرگودھا میں ایک پیر نے 22 بندے مار دیے۔ کیا پیروں کے پاس جانے سے لوگ رکے؟ حال ہی میں پھر ایک پیر نے چھ سال کا بچہ سرگودھا میں مار دیا۔ پیروں کے خلاف کیوں احتجاج نہیں کیا جاتا؟ یہاں تو معاملہ بھی ایمان کا تھا۔ ساہیوال کے واقعہ کا انجام کیا نکلا؟ ایسا اس لیے ہے کہ ہم عمل کو بھول کر عامل کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ ایک جیسا عمل کرنے والوں کے ساتھ جب یکساں سلوک نہیں ہوتا تو دوسروں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آخری خطبہ میں واضح طور پر بتا دیا کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں، نہ کسی غریب کو کسی امیر پر اور نہ کسی امیر کو کسی غریب پر۔ ہمارا ملک اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے۔ پھر اسلام کے قانون میں ترمیم کیسے ہوئی؟ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنے والوں کے خلاف جہاد، جہاد، جہاد...... یہی اللہ تعالیٰ کا فرمان...... یہی اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے جس پر 10 محرم الحرام 61ھ کو نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمل کر دکھایا۔ سب مسلمان محرم الحرام میں واقعۂ کربلا اپنے اپنے عقائد کے مطابق نہایت احترام سے مناتے ہیں مگر افسوس کہ ہم مقاصد بھول چکے ہیں۔ ہم برائی کے خاتمے کے بجائے بُروں کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ درحقیقت کربلا میں لڑی جانے والی جنگ یزید کے خلاف نہیں، بلکہ یزیدیت اور اس کے پیروکاروں کے خلاف تھی۔

وہ عشق تھا شبیرؓ کا یا میرے رب کی تھی رضا
کیسے سمجھ پائے خِرد تیری محبت کی ادا

سورۃ المائدہ آیت: 87 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”اللہ نہیں دوست رکھتا حد سے نکل جانے والوں کو۔“

اسی وجہ سے عزازیل شیطان بنا۔ یہی خاصیت نمرود وشداد کی تھی۔ اسی لیے فرعون دریائے نیل میں غرق ہوا۔ یہی یزید کا کردار تھا۔ اس کی ذات سے نہیں، ہمیں اس کے عمل سے عداوت ہونی چاہئے تھی، اس کے عقائد سے بغاوت کرنا اصل مقصد تھا۔

اب تھوڑا حقیقت پسند ہو کر دیکھیں۔ بیٹی کو وراثت سے عاق کر دیا جاتا ہے، کیا یہ انصاف ہے؟ جب لڑکے کا رشتہ طے کرتے وقت لڑکی والوں کو جہیز کی لسٹ دی جاتی ہے، کیا یہ انصاف ہے؟ جب مالدار زکوٰۃ اور ٹیکس نہیں دیتے تو کیا یہ حدود کی خلاف ورزی نہیں ہے؟ جب تاجر ملاوٹ کرتا ہے، مال کم دیتا ہے، جب کم علم عالم غلط مسئلہ بیان کرتا ہے، جب استاد کلاس کے وقت انٹر نیٹ پر مصروف ہوتا ہے، آفیسر دفتری اوقات میں مہمان نوازیاں کرتا ہے، ڈاکٹر ڈیوٹی کے وقت اسپتال سے غائب ہوتا ہے، کسی شادی یا فنکشن میں میوزک کا شور پورے محلے کے لوگوں کو بے سکون کرتا ہے جن میں بیمار اور بچے متاثر ہوتے ہیں، اپنے ذاتی مفاد کی خاطر گلیوں کو بند کر کے مسافروں کو تکلیف دی جاتی ہے، کسی کی سادگی سے فائدہ اٹھا کر اپنے غلط مقاصد میں استعمال کیا جاتا ہے، پھل توڑنے پر بچے کو مار مار کر اس کی حالت غیر کر دی جاتی ہے، ایک روٹی چرانے پر پورا پورا دن ہوٹلوں میں برتن دھلوائے جاتے ہیں، کیا یہ انصاف ہے؟ جس نے روٹی چوری کی، اس نے امیر بننے کے لیے نہیں کی ہوگی، یہ بات باعثِ شرم ہے کہ بھوک مٹانے کے لیے ایک روٹی تک اسے کسی نے نہ دی، دوسروں کی بیٹیوں کو بری نظر سے دیکھنے والوں کو اپنی بیٹیاں نظر نہیں آتیں، ان کا ضمیر احتجاج کیوں نہیں کرتا، اگر کوئی بدلے کی استطاعت نہیں رکھتا تو ایک ذات اوپر بیٹھی ہے، حساب اس نے لینا ہے۔ تقدیر وہی لکھتی ہے۔ پھر اپنے اعمال نظر نہیں آتے۔ جہاں بے بس ہو جائیں، وہاں سارا ملبہ اٹھا کر تقدیر پر ڈال دیتے ہیں۔ جیسا آج کریں گے، ویسا ہی بھریں گے۔ زمانہ کی پردہ پوشی زیادہ اہم ہوگئی ہے۔ اگر ایمان کامل ہوتا، اللہ کا خوف ہوتا، اس سے ڈرتے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے تو یہ معاشرہ ایسا نہ ہوتا۔ اللہ تعالیٰ جب چاہے اور جس کا چاہے راز فاش کر سکتا ہے، اگر نہیں کرتا تو اس کے پیچھے مصلحت ہوتی ہے۔ اس کا خمیازہ آنے والی نسلوں کو بھگتنا پڑتا ہے تاکہ گناہ گار اپنوں کو تکلیف میں دیکھ دیکھ کر توبہ کر لے یا مسلسل کرب کا شکار رہے یا پھر اس کا فیصلہ آخرت پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

کوئی برائی معاشرے میں رواج پا جائے تو اس پر عمل کرنے والے ذرا بھی نہیں جھجکتے۔ اگر کسی شرعی کام کو لوگ برا بھلا کہہ دیں تب اس جائز کام کو کرنے سے ڈر لگتا ہے کہ زمانہ کیا کہے گا؟ لوگ کیا کہیں گے؟ دنیا کی اتنی فکر؟......

وہ نہ ختم ہونے والی حیات ہوگی جہاں صرف اعمالِ صالح ہی کام آئیں گے۔ سب جاننے کے باوجود نہیں ڈرتے، اس لیے اب ضرورت اس نظام کو بدلنے کی ہے۔ اپنے عقائد و نظریات بدلنے کی اور رسم و رواج بدلنے کی۔

اللہ کی حدود سے تجاوز کرنا اصل یزیدیت ہے اور جب تک یزیدیت ختم نہیں ہوتی، اسی طرح صلاح الدین بے دردی سے مرتے رہیں گے اور اسی طرح احتجاج ہوتے رہیں گے۔ یہ وقت عزمِ بالجزم کرنے کا ہے۔ ہم سب عہد کریں کہ اس کردار کو ہم نے مارنا ہے۔ ابتدا اپنی ذات سے کرنی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے۔

آمین۔

6 ستمبر 2019ء

نام بڑے اور درشن چھوٹے!

خالقِ کائنات جو سب سے پہلا دنیاوی علم انسان کو سکھایا، وہ نام اور پہچان کا تھا جس نے انسان کو مسجودِ ملائکہ بنا کر اشرف المخلوقات کے اعزاز سے نواز کر زمین پر اللہ کا نائب مقرر ہونے کا امتحان پاس کروانے میں مدد کی۔ کسی چیز یا شخص کا نام سن کر اس کی اچھائی، برائی، خوبی، خامی، حجم، وسعت، کارنامے اور وجہِ شہرت سب سامنے آجاتے ہیں۔ نام کی اہمیت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس خصوصیت کی خوبی سے ناواقف ہونے کے باوجود اپنے ساتھ کسی کو شریک نہیں ہونے دیتے۔ چونکہ ان کی وجہ شہرت اللہ، اللہ کے رسول ﷺ صحابہ کرامؓ، اہلِ بیتؓ اور مخلوقِ خدا کی محبت ہوتی ہے، اس لیے ان کا نام سینہ بہ سینہ چلتا رہتا ہے۔ وہ چاہے قرن کے جنگلوں میں اونٹ چرانے والے اویس قرنیؒ ہوں یا خراسان کی وادیوں میں پھرنے والے علی بن عثمان ہجویریؒ یا بغداد کے جنید بغدادیؒ، یہ وہ لوگ تھے جن کا ایمان تھا کہ ہر چیز کی حد ہوتی ہے مگر تقویٰ کی کوئی حد نہیں۔ یہ سمندر ہے جس کا دوسرا کنارہ نہیں۔ ان کے عروج کو کبھی زوال نہیں آسکا اور نہ حسرتوں کی آندھیاں کچھ بگاڑ سکیں۔ انسان خطا کا پتلا ہے۔ ان سے بھی انجانے میں غلطیاں سرزد ہو سکتی ہیں پر وہ نیت دیکھتا ہے۔ اس لیے ایسے درویش کسی فانی خواہش کو دل میں بسنے نہیں دیتے۔ ان کی وجہِ شہرت دنیاوی مال و متاع، شان و شوکت، محلات اور لباس نہیں کہ عمارت کے گرنے سے ثبوت مٹ جائیں گے، کاروبار میں مندی سے لوگ بھولنے لگیں گے یا کرسی یا اقتدار چھن جانے سے بے حیثیت ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات جاننے کے باوجود جب کوئی درمیانی راستہ تلاش کرنے نکلیں، انہیں شہرت تو مل جاتی ہے مگر عزت کے فقدان کی وجہ سے نیک نامی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ مادی اسباب عارضی چیزیں ہیں۔ فرد کے ظاہری اور باطنی منظم مجموعہ کا نام شخصیت ہے۔ قابلِ پیمائش خصوصیات جس میں اس کی سیرت و کردار میں توازن، استقامت، پختگی، قول و فعل میں مطابقت اور اپنی ذات کے بارے گہرا شعور وغیرہ شامل

ہیں۔ایسے لوگوں کا جب خارجی حالات سے واسطہ پڑتا ہے تو بیرونی وسائل سے زیادہ اپنی ذاتی خصوصیات کو بروئے کار لاتے ہیں۔

وقت کے ساتھ ہر چیز میں جدت آنا زمانے کی رِیت ہے۔اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بعض لوگوں نے نام کمانے کا نیا فارمولا ایجاد کرلیا ہے۔لوہے اور پتھر کی بھاری مقدار کو مخصوص شکل دے کر محل بنائے اور ان پر اپنا نام کندہ کروا کر خود فریبی میں مبتلا ہوئے کہ ہماری عالیشان فلک بوس عمارات اندر کے عیش و آرام اور ماحول کے تعارف کے لیے کافی ہیں۔خودنمائی کے اس فرسودہ خیال نے انسان کے لیے بہت مشکلات پیدا کردی ہیں۔جیسے انسان پتھر سے نکل کر پھر پتھر میں چلا گیا ہو یا پتھر سے نکل کر پتھر کا بن گیا ہو، دونوں طرح سے جملہ ٹھیک لگتا ہے۔ان کے اندازِ تکلم میں غرور کے فوارے سے سنگ باری کرتے الفاظ کسی کو گلبدن کر بھی جائیں تو حسرتوں کے کشکول لیے درباری دوسروں کے اذہانِ زخم سے رِسنے والے لہو کو محلات میں رنگ بھرنے کے لیے ضروری قرار دے کر ضمیر کو لمبی تان کر سلا دیتے ہیں۔یہ زندہ نعشوں کے مزار موسموں کی طرح بدلتے مزاج رکھنے والے انسانوں کے ہوتے ہیں۔جہاں کئی لوگ نظر آتے ہیں مگر سب ویران مندر کی طرح۔تنہائی کی وحشت جذبۂ بغاوت کو ابھار کر رقص و سرور کی محفلوں کو دعوت دیتی ہے۔ اپنے اپنے مزاج کے مطابق موسیقی، گویے ان کا دل بہلانے کے لیے اور اپنا شکم بھرنے کے لیے جھوٹی تعریفوں کے قصیدے گاتے ہیں جس سے وقتی سکون میسر ہونے کی وجہ سے دل کھول کر وقت کے حاتم طائی بن کر پیسہ لٹاتے ہیں مگر جیسے ہی مجلس برخاست ہوتی ہے، تنہائی کا ناگ بے سکونی کی بین پر ناچنے لگتا ہے۔یہ دہری فطرت کے لوگ اپنے اندر اور باہر میں توازن قائم نہیں رکھتے۔ان کو شہرت بھی چاہئے، نیک نامی اور عیش و عشرت بھی، لیکن یہ تینوں بیک وقت نہیں مل سکتیں کیونکہ ان میں تضاد ہے۔کچھ اس ملمع کاری میں کامیاب ہو بھی جاتے ہیں تو ہر طرف ان کے نام کی دھوم ہوتی ہے۔لیکن اندر کا چھوٹا انسان ان کی ذات کے جھروکوں سے کہیں نہ کہیں سے جھانک لیتا ہے اور ان کی اصلیت کھل جاتی ہے۔بالکل ایسے جیسے کسی گدھے پر لائنیں لگا کر زیبرا بنا دیا گیا مگر جب ندی میں غسل کرے گا تو کچے رنگ اتر کر پھر گدھا ہی نکل آئے گا۔جب رجحان مصنوعی چیزوں کی طرف ہو جائے تو باطنی صلاحیت ماند پڑ جاتی ہے۔ایسے لوگوں کی مثال خوبصورت سیپ میں چھپے کیڑے کی ہوتی ہے۔سیپ اور کیڑے کا الگ وجود ہے۔انسان کی باطنی

حالت اس کی ذات کا حصہ ہے جبکہ ظاہری حالت اس کی شخصیت پر اثر انداز ضرور ہوتی ہے۔لیکن کبھی کبھی الٹ دیکھنے کو ملتا ہے۔انسان اپنی خوبیوں اور خامیوں کو خوب جانتا ہے۔پھر بھی کسی کی چرب زبانی سے خوش ہو جاتا ہے۔اپنی تعریف سب کو پسند ہوتی ہے لیکن سچائی کا شامل ہونا ضروری ہوتا ہے۔دوسروں کی نصیحت سے نفس کا مجادلہ سیدھا کرتا ہے کیونکہ اپنے آپ سے خفا ہو کر انسان کہاں جا سکتا ہے۔وقتی طور پر ہو بھی جائے تو اپنے حق میں بہتر ہوتا ہے۔وقت کی آندھی خودنمائی کے شوقین بڑے نام کے چھوٹے لوگوں کو ننگا کر جاتی ہے۔اس کے برعکس پختہ عقائد کے مالک صراطِ مستقیم کی مشکلات سے نہیں گھبراتے۔اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہر وقت ارشادِ باری تعالیٰ کو یاد رکھتے ہیں:

ترجمہ:''جو آخرت کے مقابلے میں دنیاوی زندگی کو پسند رکھتے ہیں۔اور اللہ کی راہ سے ٹوکتے ہیں اور اس میں ٹیڑھا پن پیدا کرنا چاہتے ہیں۔یہی لوگ پرلے درجے کی گمراہی میں ہیں۔''

(سورۃ ابراہیم۔آیت:3)

20 ستمبر 2019ء

مت جاؤ نزدیک......(لا تقرَ بُوا)

قاعدہ وقانون، اصول وضوابط ہر چیز کی بنیادی اکائی ہوتے ہیں۔ قانون کے تحت آب وگل کی باہم آمیزش سے انسانی پتلا تیار کیا گیا پھر جذبات کی ایک مخصوص مقدار سے دل کو بھر دیا لیکن جس جذبے کی واضح جھلک نظر آئے ہم کہتے ہیں، اس کا دل اُس جذبے سے بھرا ہے۔ یعنی اس کی مقدار زیادہ ہے۔ یہی قاعدہ تمام اشیاء کے لیے استعمال ہوتا ہے کہ خام مال کی کمی بیشی سے مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں ہو پاتے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہر چیز کی حد ہوتی ہے۔ اگر حدود کی خلاف ورزی کی جائے تو ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ادویات کی ڈبیا پر لکھا ہوتا ہے کہ بچوں کی پہنچ سے دور رکھیں۔ یہی دوا بچوں سمیت بڑوں کیلئے بھی نقصان دہ ہوسکتی ہے لیکن بچوں کو ادویات کے بلاوجہ استعمال سے شدید نقصان پہنچنے کا احتمال ہوتا ہے۔ اسی انداز سے انسان کو سمجھایا گیا ہے کہ کچھ منزلوں کے راستے پر چلنا بھی خلافِ شرع ہے۔ مسلمان ہونے کے ناطے ہم جانتے ہیں کہ کن چیزوں سے روکا گیا ہے لیکن قرآنِ پاک کے الفاظ پر بہت کم توجہ دیتے ہیں کہ کن لفظوں میں منع کیا گیا۔ کچھ مقام پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں سے آگے کتنا بڑا خطرہ ہے (لاتقربوا) کے الفاظ جہاں پر آئے ہیں:

ترجمہ: ''اے ایمان والو جب تم نشہ میں ہو تو نماز کے قریب بھی مت جاؤ یہاں تک کہ (نشہ اتر جائے) جو بولتے ہو اسے سمجھنے لگو۔''

(سورۃ النسا۔ آیت، 43)

ترجمہ: ''اور مت نزدیک جاؤ بے حیائی کے جو کچھ ظاہر ہے۔ اس میں سے اور جو کچھ کہ چھپا ہے۔ اور مت مار ڈالو اس جی کو کہ حرام کیا ہے اللہ تعالیٰ نے مگر ساتھ حق کے۔ اور مت قریب جاؤ مال یتیم کے۔''

(سورۃ الانعام۔ آیت: 152)

ترجمہ: ''اور مت قریب جاؤ زنا کے بے شک وہ ہے۔ بے حیائی اور بری ہے۔ راہ۔''

(سورۃ بنی اسرائیل۔ آیت: 32)

سختی سے منع اس لیے کیا گیا کہ خالق بہتر جانتا ہے انسانی فطرت اور نفسیات کو کہ اس کے وجود میں کس چیز کا مقابلہ کرنے کی کتنی صلاحیت ہے اور کس طرح اپنے نفس کو قابو میں لانا ہے۔ اصل امتحان ہی یہی ہے۔ خلیفۃ الارض کا کام نفس کے شترِ بے مہار کو خودغرضی، خود پرستی، سرکشی، غرور و تکبر اور نافرمانی سے بچا کر اطاعتِ الٰہی کے تابع کرنا ہے۔ اسے راہِ راست پر لانے کا عصا اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اگر آج کے دور میں ہم دیکھیں تو ہر طرف ظلم و ستم کا بازار گرم ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جس میں کسی کی عصمت دری کی خبر نہ سنیں۔ پہلے حوا کی بیٹی لٹتی رہی، اب قومِ لوط کی خباثت جنم لے چکی ہے جو معصوم بچے بچیوں کو درندگی کا نشانہ بنا رہی ہے۔ خاص کر قصور کے بے قصور بچوں کے ساتھ ہونے والے واقعات دل دہلا دیتے ہیں۔ اس وحشیانہ کارروائی سے بچنے کے لیے بچوں میں مختلف قسم کی آگاہی مہم شروع ہو چکی ہیں۔ تقریباً ہر چینل اپنی بساط کے مطابق وڈیو پیغام دوسروں تک پہنچا رہے ہیں۔ یہ وہی پیغام ہے جو ہم سب پر فرض ہے۔ ''لا تقربوا'' مت قریب جاؤ...... لیکن اس مہم میں ہم اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک بچوں کے ساتھ بڑے اس پر عمل نہیں کرتے کیونکہ بچے بڑوں سے اثر لیتے ہیں۔ موجودہ حکومت کے وزیر اعظم عمران خان نے جب پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کی بات کی تو کچھ لنڈے کے انگریزوں کو بڑی تکلیف ہوئی کہ یہ آزادی کے حق پر ڈاکہ ہے۔ اب دور بدل چکا ہے۔ جانے کیسی زندگی گزارنا پڑے۔ اصل میں یہ آزادی کے حق پر نہیں، فحاشی کے حق پر ڈاکہ ہے۔ جن کے لختِ جگر چھین لیے جاتے ہیں، ان کی تکلیف کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہی جانتے ہیں جو بھگت رہے ہوتے ہیں۔ مگرمچھ کے آنسو بہانے والے بہت ہوتے ہیں۔ ان کی تصویریں کئی کئی دن تک سوشل میڈیا کی زینت بنی رہتی ہیں لیکن جانے والے نہیں لوٹ کر آنے والے۔

بیشتر غیر مسلم ترقی یافتہ ممالک ایسے بھی ہیں جہاں جنسِ مخالف کو چھونا غیر اخلاقی، غیر قانونی اور قابلِ سزا جرم تصور کیا جاتا ہے۔ افسوس صد افسوس! ہم محض نام کے مسلمان کہلاتے ہیں لیکن عمل سے کوسوں دور۔ ہمارے دینی و اسلامی ضابطے ملکی تعزیری قوانین کا حصہ نہ بن سکے۔ ہمارے

مغربی طرز کے تعلیمی اداروں میں تو بلاتفریقِ جنس مصافحہ و معانقہ کی کھلی چھٹی ہے۔ اربابِ اختیار اور حکمرانوں سے مودبانہ گذارش ہے کہ معاشرے کے سدھار کیلئے سخت ترین سزاؤں کا نفاذ عمل میں لایا جائے گا تو ممکن حد تک ریاستِ مدینہ کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے گا۔

اس ایک عمل کے رکنے سے کتنی معاشرتی برائیوں سے نجات مل سکے گی؟ خاص طور پر جعلی پیروں کے کتنے پروگرام دکھائے جاتے ہیں؟ کس طرح لوگوں کی عزتوں سے کھیلتے ہیں؟ برائی اصل میں وائرس کی طرح تیزی سے پھیلتی ہے۔ اس بیماری کے مریض آنکھوں سے اندھے اور کانوں سے بہرے ہوتے ہیں۔ حکومت کے علاوہ معاشرے کی بھی اہم ذمہ داری ہے کہ ان مسائل کے حل پر بھرپور توجہ دیں۔ کب تک اور کس کے خلاف احتجاج کرتے رہیں گے؟ ظلم و بربریت دیکھ کر وقتی ردِعمل سے مسائل حل نہیں ہو سکتے بلکہ سنجیدگی سے قانون سازی کرنا ہوگی تاکہ آئندہ ایسے اندوہناک سانحات سے نجات ممکن ہو سکے۔ جب عمومی سزاؤں پر قانون کے مطابق عمل درآمد ہوگا تو جرائم پیشہ، سفاک، سنگدل اور بے ضمیر لوگ عبرت پکڑیں گے۔ جب معصوم متاثرہ بچوں کے لواحقین کو قانون کے مطابق انصاف ملے گا تو ان کی اشک جوئی ہو سکے گی۔ لوگوں کے علم میں ہوگا کہ عورت کو پردے کے حکم سے قبل مردوں کو نظریں جھکانے کے حکم کی آیت نازل ہوئی تھی۔

22 ستمبر 2019ء

آزادیٔ کشمیر میں عوام کا کردار

امن پسندی فطری صفت ہونے کی وجہ سے ہر انسان کو پسند ہے مگر دشمنِ انسان طرح طرح کے حربے استعمال کر کے اشتعال انگیزی کو ہوا دیتا ہے۔ قلب میں مقیم ہو کر پورے وجود پر حکمرانی کرتا ہے۔ اگر مدِ مقابل میں قوتِ مدافعت ہو تو ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے ورنہ ہتھیار ڈال کر اس کے اشاروں پر ناچنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ انسان کا کھلا دشمن ہے، اس کا سب سے پسندیدہ عمل انسانوں میں دراڑیں ڈالنا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ عمل سخت ناپسند ہے۔ ہابیل اور قابیل سے شروع ہونے والی جنگ آج تک کسی نہ کسی فورم پر جاری ہے۔ ایک ظالم تو دوسرا مظلوم، یا حق و باطل کی جنگ، یا آزادی و غلامی کی جنگ، یہ انسان پر اسی لیے فرض کر دی گئی ہیں کہ اگر کوئی دوسرا انسان تخلیقِ کائنات کے احکامات کے مطابق زندگی گزارنے میں مداخلت کرے اور فرائض کی ادائیگی میں رکاوٹ ڈالے تو ایسے انسان کے خلاف جنگ فرض ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک اہلِ کشمیر مسلمان ہونے کی وجہ سے خاک و خون کی وادی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ظلم و ستم اور جبر و تشدد کی انتہا دیکھنی ہو تو کشمیر چلے جاؤ۔ اس کے باوجود اس قوم کے جذبوں میں کوئی انحطاط نہیں آیا۔ ان کا ایمان اس بات پر پختہ ہے کہ مایوسی کفر ہے۔ کشمیر کی وادی کے حالات میں بہت سے نشیب و فراز آئے۔ جب ظلم حد سے بڑھتا ہے تو وہ مٹ جاتا ہے کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰؑ پیدا کیا۔ ہر دور میں حصولِ آزادی کی آواز کو مختلف طریقوں سے دبانے کی کوشش کی جاتی رہی۔ پاکستان اور ہندوستان کے مابین دو جنگیں بھی ہو چکیں مگر حالات جوں کے توں ہیں۔ موجودہ دور میں کئی روز سے کرفیو نافذ ہے۔ اس مسئلہ کو دوبارہ اقوام متحدہ تک پہنچایا گیا۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ پوری دنیا کے سامنے بھارت کا مکروہ چہرہ بے نقاب ہو گیا۔ وزیر اعظم پاکستان کی تقریر اور مطالبے کے بعد کشمیریوں کے حوصلے اور بلند ہو گئے ہیں لیکن ہمیں صرف اقوامِ مغرب کے فیصلوں کا انتظار نہیں کرنا چاہئے بلکہ قوم کو ساتھ احتجاج جاری رکھنا ہوگا۔ اپنی اپنی ذمہ داریاں نبھانا ہوں گی۔

اپنے اندرونی اختلافات کو بھلا کر یک جان ہو کر مقابلہ کرنا ہوگا۔ ہر فورم پر لڑنا ہوگا۔ بنیادی نقطۂ نظر کو سامنے لانا ہوگا کہ اسلام مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ مسلمان اپنی پوری زندگی اسلام کے مطابق گزارتے ہیں۔ ہمارا رہن سہن الگ ہے۔ اور یہ تب ثابت ہوگا جب ہم ہندوانہ تہذیب کا بائیکاٹ کریں گے۔ اپنے معاشرے میں شامل ان کے رسم و رواج ختم کر کے الگ قوم ہونے کا واضح ثبوت دے کر ایک ایسا انقلاب لائیں جو خالص دین اسلام پر ہو۔ اس طریقے سے امتِ مسلمہ کو ایک پلیٹ فارم پر لایا جا سکتا ہے لیکن سب سے پہلے ہمیں خود یہ کر کے دکھانا پڑے گا۔ جیسے انڈین ٹی وی چینل بند کیے گئے ہیں، اسی طرح ان کی فلموں اور گانوں کا دیکھنا اور سننا بھی ترک کرنا ہوگا۔ فلم انڈسٹری بھارت کی سب سے بڑی انڈسٹری ہے۔ اسے ہر میدان میں ہرانے کے لیے اس پر عمل ضروری ہے لیکن یہ کام حکومت نہیں عوام کرے گی۔ ان کی مصنوعات خریدنے سے گریز کریں چاہے جتنی کم قیمت میں ملے۔ ''کشمیر بنے گا پاکستان'' کا خالی نعرہ لگانے سے کشمیر آزاد نہیں ہو جائے گا۔ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ اگر ہم یہ سب کر لیتے ہیں، تب بھی کشمیریوں کے مقابلے میں ہماری یہ کوشش کچھ بھی نہیں۔ جس طرح خواتین کے ساتھ سلوک ہو رہا ہے، بوڑھوں اور بچوں پر مظالم ڈھائے جا رہے ہیں، انہیں ان انسانیت سوز حالات سے نکالنے کے لیے ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔

ہم اپنے اندازِ زندگی پر نظر ڈالیں تو بالکل اسلام کے مطابق نہیں۔ کہاں ہے انفرادیت؟ یہ ملک ایک تجربہ گاہ کے طور پر حاصل کیا گیا تھا۔ ہم خود اس راستے سے رخ پھیر کر دوسری طرف چل نکلے ہیں جو انسانی شرف کے خلاف ہے۔ پوری قوم کی توجہ ان عوامل کی طرف دلانا ہوگی کہ ہم کشمیریوں کے ساتھ ہیں۔ وقتی طور پر جن افکار سے مرعوب ہو جاتے ہیں، یہ صراطِ مستقیم نہیں بلکہ ''وساء سبیلا'' ہے۔ وقت بدلے گا۔ کشمیریوں کی قسمت بدلے گی۔ ان شاء اللہ! ان کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ ہمیں اپنے دل کی گہرائیوں اور ذہن کی جولانیوں کو نئے تصورات سے روشناس کروانا ہوگا۔ اسلام ہی جدید تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ بوسیدہ اور مصنوعی تقلید کے خلاف آواز بلند کرنا ہوگی کیونکہ یہی وجہِ انحطاط ہے۔ انہی الجھنوں میں الجھ کر باہم گریباں ہو کر اپنا نقطۂ نظر بھول چکے ہیں۔ اگر ہم نے عظیم قوم کی حیثیت سے دنیا میں آبرومندانہ زندگی گزارنا ہے تو آپس کی تلخیوں کو بھلا کر ایک ہو کر اپنے مقصد کے لیے جد و جہد کرنا ہوگی۔ اپنے مذہب سے محبت، اپنی قوم سے محبت، اپنے وطن سے محبت...... جو اس پر متفق نہیں ہوتا اسے پھر غدار ہی کہا جا سکتا ہے۔

2 اکتوبر 2019ء

لبادۂ عشق

اکثر لوگ خواہشات اور ضروریات کے مابین فرق سے لاعلم ہونے کی وجہ سے دونوں کو ایک ہی درجہ میں شمار کرتے ہیں جس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات وقتی خواہشات کو اہمیت دے کر بنیادی ضروریات کو پسِ پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ ان اصولوں کی پیروی کرنے کی وجہ سے غلط نظریات کا رواج عام ہو چکا ہے۔ اگر بات کی تہہ میں جائیں تو پتہ چلتا ہے کہ ضروریات وہ ہیں جن کے بغیر زندگی گزارنا مشکل ہو، جیسے روٹی کپڑا مکان وغیرہ۔ ان کی ایک حد ہوتی ہے جبکہ خواہشات ان سے اگلا قدم ہے۔ انہیں بروقت لگام نہ ڈالی جائے تو یہ بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ انہیں آزاد چھوڑنا دلدل میں قدم رکھنے کے برابر ہے، جہاں سے واپسی کا راستہ نہیں۔ اس کا اطلاق زندگی کے ہر میدان میں ہوتا ہے۔ مالکِ کونین نے انسان کو آزاد پیدا کیا لیکن وہ اپنے نفس کا غلام بن کر رہ گیا۔ یہ سب غلط تقلید کا نتیجہ ہے۔ اللہ کے کسی برگزیدہ بندے نے کہہ دیا کہ عشق و محبت میں کوئی حد نہیں ہوتی، وہ ہوگا اللہ کا ولی، اس کا مطلب یہ تھا کہ تقویٰ کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ سننے والوں نے اس جملے کو عام کر کے اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیا ورنہ فرائض کی بھی حد مقرر ہے۔ دو کی جگہ چار پڑھنے سے نماز نہیں ہوگی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اصول ہر ایک بات پر لاگو نہیں ہوتا۔ دیکھا دیکھی سے بچنے کے لیے شاعر فرماتے ہیں:

نرالے ہیں انداز دنیا سے اپنے
کہ تقلید کو خودکشی جانتے ہیں

ایک وہ عشق جس میں فرضی طوافِ کعبہ کے دوران کعبہ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی جائز نہیں، جس کے دوران آج کل فوٹو گرافی اور مووی بن رہی ہوتی ہے، باتیں کی جاتی ہیں۔ جب فرض آن لائن ادا ہونے لگیں گے تو اصل مقصد بہت پیچھے رہ جائے گا۔ خواہشِ نفس اور ضرورت میں فرق ہے۔ کوئی کام بھی کرنا مقصود ہو تو اس کی بنیاد دیکھی جاتی ہے، اس کی ابتدا کیسے ہوئی، ان

اصول وضوابط کے مطابق عمل کیا جاتا ہے۔ عاشقِ رسول ﷺ بننے کے لیے ہمیں صحابہ کرامؓ کی زندگیوں کو دیکھنا پڑے گا کیونکہ ہم میں ان سے بڑا کوئی عاشقِ رسول ﷺ ہو ہی نہیں سکتا۔ انھوں نے عملی مظاہرہ کس طرح کیا، اس تاریخ کو جانے بغیر تمام دعوے مسترد...... ان کے والہانہ عشق کے اظہار کے لیے الفاظ کا چناؤ بھی مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے محبوب ہستی آپ ﷺ کو مانتے اور ان کے عقائد وقلبی لگاؤ کی نوعیت جذباتی نقطۂ عروج پر تھی۔ آج کے دور میں نعت شریف پڑھنے والے خود ساختہ عاشقِ رسول ﷺ ہیں۔ اب ذرا موازنہ کریں باطنی جذبہ نہ دیکھا جا سکتا ہے نہ ناپا جا سکتا ہے لیکن ظاہری لباس کو دیکھیں۔ شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں جب کوئی محفلِ نعت منعقد ہوتی ہے، اس کے اشتہارات شوخ رنگ کے لباس والے نعت خواں کی تصویروں سے بھرے ہوتے ہیں۔ یہ ایک پہچان بن گئی ہے۔ کیا ہمارے نبی پاکؐ نے یا صحابہ کرامؓ نے کبھی ایسا لباس زیب تن کیا؟ نہیں نا...... سب سے پہلے ان کے لباس درست کروائے جائیں تاکہ جن ہستیوں کی پیروی کر رہے ہیں، دیکھنے میں ان جیسے نظر آئیں۔ اب ایک سوال ان لوگوں سے بنتا ہے جو اس طرح کے کام عبادت سمجھ کر کرتے ہیں۔ کیا ایسے کام صحابہ کرامؓ نے کیے؟ کیا کسی پر اس طرح پیسوں کی بارش کی گئی؟ کیا اس طرح کی میلاد کی محفلیں ہوتی تھیں جن میں نماز کے اوقات کے دوران وقفہ نہیں ہوتا تھا؟ نماز کسی صورت معاف نہیں۔ کربلا میں اس پر عمل کر کے دکھایا گیا۔

ایک محفل میں راقم کو شمولیت کا موقعہ ملا۔ وہاں کچھ اس طرح کے کلمات سننے کو ملے، توجہ فرمائیے گا...... پنجابی میں الفاظ کچھ ایسے تھے:

رج رج کے تو کھایا کر

رنگ لگ جاون گے، تو نبیؐ دا میلاد منایا کر

جبکہ حدیثِ پاک کے الفاظ کچھ اس طرح ہیں کہ بھوک رکھ کر کھایا کریں۔

نیکی کے جس کام کا ارادہ کریں، پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ قرآنِ پاک اور حدیثِ پاک میں کس طرح اس سرانجام دینے کا حکم ہے۔ اگر واضح احکامات جاری کیے گئے ہوں، پھر بھی اس راستے کو چھوڑ کر دنیاداری میں پڑیں، یہ کھلی گمراہی ہے۔ اس پر کس طرح پچھتانا پڑے گا۔ سورۃ الفرقان میں کچھ اس طرح ارشاد ہوا ہے۔

ترجمہ: ''ہائے میری کم بختی کاش میں نہ پکڑتا فلاں کو دوست۔''

(سورۃ الفرقان۔آیت،28)

جو دوستوں کی باتوں میں آ کر غلط کام کر جاتے ہیں، دوستی کی خاطر اس پر بھی افسوس کرنا پڑے گا۔اچھے دوست نعمت سے کم نہیں ہوتے۔

ترجمہ: ''اور پیغمبر (اس وقت) یہ عرض کرے گا مالک میرے میری قوم اس قرآن کو چھوڑ بیٹھی۔''

(سورۃ الفرقان۔آیت:30)

نعت خواں صرف نعتِ رسولؐ پڑھتے ہیں۔ان کے پاس اگر اسلام کا علم نہ بھی ہو تو یہ کام پھر بھی کر سکتے ہیں۔کچھ میں شرکیہ کلمات اور کسی میں شانِ رسولؐ کو کم کیا جاتا ہے لیکن جہالت کا یہ عالم ہے کہ لوگ ان سے مسئلے مسائل پوچھنا شروع کر دیتے ہیں۔ان کو اپنی ایمانداری سے کسی عالمِ دین کے پاس بھیجنے کے بجائے سنی سنائی بات بتا دینا کہاں کا انصاف ہے؟ اگر کسی نعت خواں سے پوچھا جائے کہ ان کا ذریعۂ معاش کیا ہے؟ سب کے پاس ایک ہی جواب ہوتا ہے کہ ''ہم محبوبِ خداؐ کا ذکر کرتے ہیں، روزی کا بندوبست وہ خود کر دیتا ہے۔'' اگر ایسا ہی ہے تو پھر اپنے گھر میں بیٹھ کر ثواب کمایا کریں۔اور تو اور، جس سوشل میڈیا پر جائیں، وہیں انہوں نے اپنے اکاؤنٹ بنا رکھے ہیں جس کو لائک کروانے کے لیے دوسروں پر جذباتی اٹیک اس طرح کرتے ہیں کہ ''اس پیج کو لائک اور شیئر کرنے سے شیطان آپ کو روکے گا۔'' ان سے کوئی یہ پوچھے کہ شرکیہ کلمات کی وڈیوز شیئر کرنے کا حکم دینے والا کس زمرے میں آئے گا؟ سوال پھر وہی پیدا ہوتا ہے کہ حمد و نعت کو، صحابہ کرامؓ سے بہتر کوئی نہیں پڑھ سکتا تھا۔پھر وہ کیوں کاروبارِ دنیا کرتے رہے جبکہ انہیں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر زیادہ یقین تھا۔اگر ریاستِ مدینہ بنانا ہے تو ان رسموں کو بدلنا پڑے گا۔ گانوں کی طرز پر نعت پاک پڑھی جا رہی ہیں۔ساتھ رقص بھی رواج پا رہا ہے۔ان کو کون روکے گا؟ محبت ایک جذبہ ہے، اسے کاروبار سے الگ کرنا ہوگا۔اگر کاروبار بنانا ہے تو پھر عشق کا لبادہ اتارنا پڑے گا۔اس ہستی کے نام پر کاروبار کرنے والے کس منہ سے اپنے مالک کے سامنے کھڑے ہوں گے؟ ابھی وقت ہے، ذرا سوچیں، اپنے آنے والے کل کے لئے۔

7 اکتوبر 2019ء

دیارِ غیر

انسان کا دل تنہا جنت میں بھی نہیں لگا تھا جہاں ہر طرح کی نعمتیں تھیں۔ اس کو اپنے جیسا انسان چاہئے تھا ورنہ فرشتوں کی کمی نہ تھی۔ یہ جذبہ انسانی فطرت میں شامل ہے کہ وہ معاشرہ (کمیونٹی) بنا کر رہنا پسند کرتا ہے۔ ہر ملک، شہر اور بستی کے لوگوں میں کچھ طرزِ زندگی اور عادتیں مشترک ہوتی ہیں۔ اگر کسی کو اپنی تہذیب سے پیار ہو اور اسے الگ رہنا پڑے تو بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہ احساس اس وقت ہوتا ہے جب ان سے جدا ہو کر رہنا پڑے۔ پاس رہتے ہوئے اتنی قدر نہیں ہوتی۔ دیارِ غیر کی زندگی کی مثال ایسے ہے جیسے ہوا کے بگولے خاک کے ذرات کو کسی سمت کا تعین کیے بغیر اڑا کر۔ لے جاتے ہیں۔ ان کی منزل کیا ہے، ہوا خود نہیں جانتی۔ اسے چلانے والا ہی جانتا ہے۔ کچھ لوگ مزاحمت کیے بغیر پھٹے غباروں کی مانند اپنے آپ کو وقت کے دھارے پر چھوڑ دیتے ہیں۔ انہیں کششِ ثقل پر اتنا بھروسہ ہوتا ہے کہ آخر گرنا نیچے ہی ہے اور زمین اتنی مہربان ہے کہ ہر وقت ان کے لیے بانہیں کھولے انتظار میں رہتی ہے۔ دھرتی چونکہ ماں جیسی ہوتی ہے اس لیے یہ بھی اپنے ملک سے باہر جا کر پتہ چلتا ہے کہ وطن ہمیں کیا دیتا ہے اور ہم اسے کیا لوٹاتے ہیں۔ نقل مکانی کرنے والوں کو دو گروہوں میں منقسم کیا جائے تو درست ہوگا۔ ایک جو شوقیہ طور پر جاتے ہیں، پڑھائی، کاروبار یا ملازمت کے لیے...... دوسرے وہ جنہیں بھیجا جاتا ہے کیونکہ اپنے ملک میں کام کرتے ہوئے کوئی دیکھے گا تو توہین ہوگی۔ ایک وجہ کرنسی ریٹ کا کم ہونا بھی ہے۔ اگر تنخواہ ریال، ڈالر اور پونڈ میں ملے، خرچ روپوں میں ہو تو جلد ترقی کی منازل طے کریں گے۔

چونکہ یہ مقصدِ خاص کے تحت جاتے ہیں اس لیے سفر کی تھکان، اپنوں سے جدائی، نئی جگہ، نیا ماحول، نئے لوگ، رہن سہن، آب و ہوا، رہائش، نوکری اور داخلہ ان سب کا مقابلہ بیک وقت کرنا پڑتا ہے، اس لیے ذہنی انتشار اور مصروفیات کی وجہ سے اپنے اہلِ خانہ اور خاندان سے روابط کم ہو جاتے ہیں۔ جن میں محبت، روایتی تہذیب اور حب الوطنی کے جذبے کا فقدان ہوتا

ہے، وہ اس وقتی قطعِ تعلق کو اپنی ذات کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ اپنے مقصد کو سامنے رکھ کر نئے رنگ کو جزوِ بدن بنانے کی صلاحیت سے بھرپور فائدہ اٹھا کر جلد ہی اس ماحول کو اپنا لیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بھول جاتے ہیں کہ ان کی راہ تکنے والے بھی موجود ہیں۔ کالج میں کچھ ہم جماعت ایسی بھی تھیں جن کے منگیتر غیر ممالک گئے اور واپس کبھی پلٹ کر نہ دیکھا۔ وہ ان کے انتظار میں تھیں۔ ہر بات میں کسی نہ کسی طرح ان کا ذکر کر دیتیں۔ اس کیفیت کو دیکھ کر حقیقی تڑپ کا اندازہ لگانا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ یہ کوئی حساس دل ہی سمجھ سکتا ہے کہ ان پر کیا گزر رہی ہے۔ میں نے ان پر ایک نظم لکھی جس کا عنوان تھا...... ''قاصد''......

اے چاند کی کرنو! جاؤ نا
کچھ اس کو بھی تم سمجھاؤ نا
راتوں کو وہ خود تو سوتا ہے
تُو یاد میں جس کی روتا ہے
اے چاند کی کرنو جاؤ نا
کچھ اس کو بھی تم سمجھاؤ نا
اک دیس میں اس کے لڑکی ہے
وہ یاد اسی کو کرتی ہے
ہر پل وہ آہیں بھرتی ہے
جیتی ہے۔ نہ ہی وہ مرتی ہے
وہ دردِ جدائی سہتی ہے
تو لوٹ کے گھر آ کہتی ہے
کچھ اس کو بھی تم سمجھاؤ نا
اے چاند کی کرنو! جاؤ نا
جب یاد وہ سب پل آتے ہیں
آنسو بھی رواں ہو جاتے ہیں
سب لوٹ کے موسم آتے ہیں

اب تم بھی تو واپس آؤنا
اے چاند کی کرنو! جاؤنا
بس اتنا ہی کہنا ہے تم سے
اب دور نہیں رہنا تم سے
اے چاند کی کرنو! جاؤنا
کچھ اس کو بھی تم سمجھاؤنا

اس طرح دوراہے پر کھڑے لوگ ان کی راہ تکتے رہتے ہیں۔ ادھر وہ نئے ماحول میں ڈھل کر سب کچھ بھول چکے ہوتے ہیں۔ دوسرے جو دیارِ غیر میں رہ کر بھی اپنے نظام سے چمٹے رہتے ہیں، ان کے جانے سے گھر میں ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے اور یہی خلا ان کی زندگیوں میں بھی رہتا ہے۔ وہ دن رات محنت کر کے اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر واپس لوٹنا چاہتے ہیں۔ مالی مشکلات کی بنا پر جانے والے خود وہاں بھوکے رہ کر بھی سارا پیسہ یہاں بھیجتے ہیں۔ پیسہ دیکھ کر اہلِ خانہ کی مدتوں سے سوئی ہوئی تمام خواہشات بیدار ہونے لگتی ہیں اور ماضی کی محرومیوں کا ازالہ شروع ہو جاتا ہے۔ اب جانے والوں کی ذات پیچھے چلی جاتی ہے اور پیسہ خلا کو بھرنا شروع کر دیتا ہے۔ جب وہ چھٹی پر آئیں تو سب کے لیے تحفے تحائف لانا جیسے ان پر واجب ہو جاتا ہے۔ اب چونکہ وہ مہمان بن کر آتے ہیں، اس لیے سب ذہنی طور پر تیار ہوتے ہیں کہ چند دن کے بعد انہوں نے واپس چلے جانا ہے۔ اس لیے ان کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ توقعات سے بڑھ کر پروٹوکول کو عزت و محبت سمجھ کر پردیس کی ساری تکالیف وقتی طور پر بھول کر واپسی کا عزمِ سفر کرتے ہیں۔ گھر والے بھی روٹین سے ہٹ کر زندگی سے تنگ آ چکے ہوتے ہیں۔ اس لیے خوشی خوشی الوداع کہہ کر اپنی لائن پر آ جاتے ہیں۔ نیا نیا پیسہ اور باہر کے تحائف دوسروں کو دکھانا اب ان پر واجب ہو جاتا ہے۔ سونے کی جیولری جس کا آج کل نفیس طبقے میں رجحان تقریباً ختم ہو چکا ہے، لیکن ان لوگوں کی مجبوری ہوتی ہے ورنہ کسی کو کیسے پتہ چلے گا کہ یہ زندگی کے نئے زینے میں قدم رکھ چکے ہیں......

یہاں یہ بات توجہ طلب ہے کہ جن کے شوہر باہر رہتے ہیں، وہ دولت کے بل پر بڑی اچھی زندگی گزار رہی ہوتی ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو ان کے بچے بھی ہوتے ہیں، گھریلو ذمہ داریاں قدم قدم پر انہیں کون پورا کرے؟ سسرال میں ان کے شوہر، سسر اور بیٹوں کے علاوہ سب نامحرم ہوتے

ہیں، انہیں زیادہ تر سفر غیر محرموں کے ساتھ ہی کرنا پڑتا ہے۔ ایک حدیثِ پاک کا مفہوم کچھ ایسے ہے کہ جنت میں سو لوگ جائیں گے، ننانوے مرد اور ایک عورت۔ صحابہ کرامؓ نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ ''سونے اور ریشم کی وجہ سے''...... سونا اور ریشم پہننا عورت کے لیے جائز ہے لیکن غیر محرم کی نظر سے بچ کر اور وہ جو پہنے بھی، انہی کو دکھانے کے لیے، ان کا کتنا بڑا نقصان ہے۔

اب چلیں دیارِ غیر میں رہنے والوں کی طرف...... ان کا چونکہ گھر والوں سے رابطے کا فوری اور سستا ذریعہ انٹرنیٹ ہوتا ہے، اس لیے آن لائن رہنا ان کی ضرورت ہے۔ ہر وقت گھر والوں سے بات نہیں ہوتی۔ اس لیے سوشل میڈیا کے باقی سارے ذرائع بھی استعمال ہوتے ہیں۔ فارغ وقت میں لفظی پیغام رسانی ان کا مقبول مشغلہ بن جاتا ہے۔ عادت یا شاید ضرورت، اس طرح ان کا اچھا وقت گزر جاتا ہے۔ گھر والے بھی اپنی عادتیں بدل چکے ہوتے ہیں۔ مفلسی کے دور گئے۔ اس لیے اپنوں کی دوری کی یاد اتنا بھی نہیں ستاتی۔ فاصلے بڑھنے لگ گئے مگر دور دراز بیٹھے اشخاص اس سے ناواقف ہوتے ہیں۔ وہ یہی سمجھتے ہیں کہ ہم بہت اہم ہیں۔ اگر اس غلط فہمی کی بنا پر کچھ فیصلہ کر کے واپس لوٹ آئیں تو چند دنوں میں انہیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ جو خلا ان کے جانے سے پیدا ہوا، وہ کب کا بھر گیا۔ زمانہ بدل گیا، لوگ بدل گئے، حالات و واقعات سب ماضی کا حصہ بن گئے...... نہ چاہتے ہوئے بھی کسی اور تہذیب میں اتنا عرصہ گزارنے کے بعد ان کی عادتیں بدل جاتی ہیں، اس لیے اپنوں کے ساتھ مطابقت نہیں ہو پاتی۔ پھر نہ وہ مہمان ہوتے ہیں اور نہ پہلے والی توجہ مل پاتی ہے۔ دوستوں کا بھی یہی حال۔ خوشامدی آنکھیں پھیر لیتے ہیں کیونکہ کسی مہنگے تحفے کی امید نہیں ہوتی۔ اب صورت بالکل توقع کے برعکس ہو جاتی ہے۔ پھر وہی ذہنی انتشار جو دیارِ غیر میں جا کر پیدا ہوا۔ سچ کہتے ہیں کہ تاریخ خود کو دہراتی ہے۔ ایسے انسان قابلِ رحم بن جاتے ہیں۔ جن کی خاطر وہ تکالیف برداشت کرتے ہیں، ان کی صرف خواہشات پوری کر سکتے ہیں مگر تربیت سے غفلت برتنا بہت بڑی بھول ہوتی ہے۔ والدین کا بنیادی فرض اولاد کی تعلیم و تربیت ہے۔ ان اے ٹی ایم مشینوں میں اب کیش نہیں ہوتا۔ ان کے پاس دو راستے ہوتے ہیں۔ یا واپس جا کر کسی اولڈ ہوم میں پناہ لیں یا اپنوں کے درمیان اجنبیت کی زندگی گزاریں۔ دونوں صورتوں میں علاج ماہر نفسیات کا چلتا ہے۔

26 اکتوبر 2019ء

صنفِ نازک

مقابلے کی دوڑ میں شامل ہونا ہر انسان کا فطری تقاضا ہے۔ اس سے ارادے میں پختگی کے ساتھ منزل کو پانے کا شوق پیدا ہوتا ہے جو ہمارے جوش و ولولہ کو متحرک رکھنے کے علاوہ اصلاح پذیری کے عمل میں بھی مددگار ثابت ہوتا ہے۔ ہمارا قدرتی ماحول، جسمانی ساخت، معاشرتی دائرہ اور مذہبی عقائد اس پر کچھ حدود عائد کرتے ہیں۔ ان حدود کے اندر رہ کر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر، فضاؤں میں اڑنے سے لے کر خیالوں کے محل بنانے تک، آزادی کے ساتھ مقابلے میں حصہ لے کر اپنے ہنر کا لوہا منوا سکتے ہیں لیکن خالقِ کائنات نے جسمانی لحاظ سے مرد کو طاقت دے کر عورت کا محافظ بنا دیا اور عورت کو نزاکت دے کر صنفِ نازک بنا دیا۔ نام سے ہی ظاہر ہے کہ کوئی قیمتی، نفیس اور نایاب چیز۔ اب یہ ان کے کردار کے حسن میں شمار ہوتے ہیں مگر وقت اور حالات سب کے لیے ایک جیسے نہیں ہوتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جن خواتین کے خاندان میں مرد نہیں ہوتے، انہیں ساری ذمہ داریاں خود اٹھانا پڑتی ہیں۔ زمانے کی بے رحم موجوں سے لڑ کر اور راستے کے پتھروں سے ٹکرا کر اپنے آپ کو مضبوط بنا لیتی ہیں۔ ان کی دیدہ دلیری وقت کی ضرورت ہونے کی وجہ سے زمانے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھا جاتی ہے۔ معاشرہ انہیں کن القابات سے نوازتا ہے، یہ الگ کہانی ہے، کچھ بہادر کہیں گے، کچھ بے ڈر، کسی کو ان پر ترس آئے گا، کسی کو غصہ، کچھ قابلِ رحم، کچھ نفرت کے قابل بھی نہیں سمجھتے...... انہیں دیکھ کر کچھ بہنیں اپنی قسمت پر رشک کرتے ہوئے کلمۂ شکر ادا کرتی ہیں کہ ان جیسی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کے برعکس آزادانہ زندگی کی شوقین چادر و چاردیواری کو پاؤں کی زنجیر سمجھ کر اس کے فوائد و نقصانات جانے بغیر نجات حاصل کرنے کے لیے دن رات جدوجہد کرتی ہیں۔ آزادئ نسواں پر باقاعدہ کئی پروگرام ہوتے ہیں۔ خواتین کے ساتھ مرد بھی اس کے حق میں بولتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق مجبور خواتین جو دہلیز سے باہر قدم رکھتی ہیں، بہت اچھی زندگی

گزار رہی ہوتی ہیں لیکن یہ فارمولا اپنے گھر استعمال نہیں کرتے۔

یہ دیکھ کر پریشانی سے زیادہ حیرانی ہوتی ہے کہ وہ حضرات جو اس کے حق میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں، آخر خود عمل درآمد کیوں نہیں کرتے؟ اس سے ثابت ہوا کہ ان کا مقصد شکار کو محفوظ مقام سے نکال کر صید گاہ میں لانا ہے تاکہ ان کی سوچ کی پرواز کے پر کاٹ کر مہرہ بنا کر استعمال کیا جائے۔ لیکن اس دور میں بھی کچھ خواتین اچھی طرح جانتی ہیں کہ پتھر پہاڑ سے الگ ہوجائے تو روڑا بن کر پاؤں کی ٹھوکریں کھاتا ہے، اس لیے اپنا مقام یاد رکھنا چاہئے۔ اگر مرد کو جسمانی طاقت دی ہے تو عورت کے قدموں میں جنت رکھ دی۔ یہ عزت مرد کو نہیں دی گئی۔ اسے تحفظ دینا والد، بھائی، شوہر اور بیٹے پر ہے لیکن عورت پابند بھی نہیں۔ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ سب سے بڑی ذمہ داری انسان کی تربیت ہے۔ بچے کی پہلی درسگاہ ماں کی گود ہوتی ہے۔ ماں جیسا بنانا چاہے بچے کو بنا سکتی ہے۔ سیکھنے کا عمل یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ یہ کوئی چھوٹی سی ذمہ داری نہیں۔ وہ سوچ کی معمار ہوتی ہے۔ اسلام نے عورت کو وہ مقام و مرتبہ دیا ہے جو کسی اور مذہب نے نہیں دیا۔ بیوہ پر بچوں کی پرورش کا بوجھ ہو تو وہ اکیلی اس امتحان سے نہیں گزر رہی ہوتی بلکہ صاحبِ حیثیت معاشرہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے، ان کا بھی امتحان ہوتا ہے۔

اس فلسفے کو سمجھنے کے لیے ایک خاص دل و دماغ اور مکتبۂ فکر کی ضرورت ہوتی ہے جو ہر ایک کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ کچھ اصول وضوابط ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ جنگل کا بھی کوئی قانون ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ان بہنوں کے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے جنہیں طلاق کے ساتھ بچے بھی سونپ دیے جاتے ہیں۔ پھر وہ دربدر کی ٹھوکریں کھاتی، اپنی تذلیل کرواتی، سب کچھ مجبوراً برداشت کرتی ہیں۔ ان کو کس گناہ کی سزا دی جاتی ہے، عورت ہونے کی یا اکیلے ہونے کی؟ اللہ کا قانون تو کیا، ملک کا قانون بھی اس کی اجازت نہیں دیتا۔ پھر یہ کیا ماجرا ہے؟ یتیم کی ذمہ داری پورے معاشرے پر فرض ہوجاتی ہے۔ چند لوگوں کے ادا کرنے سے سب کی طرف سے ادا ہوجاتی ہے ورنہ سب اوپر والے کی پکڑ میں ہوں گے لیکن یہاں داستاں ہی الٹی ہوگئی۔ عورت کو مرد کا تحفظ ہمارا اسلام دیتا ہے لیکن مرد اپنی ذمہ داری کو بھلا کر اس کے الٹ چلنا شروع ہوگیا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے یاد دلایا ہے کہ اگر ایسا نہیں کرے گا تو قانونِ قدرت کی خلاف ورزی ہوگی اور وہ تیرے زوال کا سبب بنے گا۔ اس حقیقت کو کچھ یوں لفظی جامہ پہنایا:

نے پردہ ، نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکامات کو بھول کر ہم دنیائے فانی کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ جب کسی کو مشکل میں دیکھیں، اس کی مدد کریں، ہمیں یہ تعلیم دی گئی اور ہم دوسروں کے لیے مصیبتوں کے پہاڑ کھڑے کر دیتے ہیں۔ ذرا سی بات دل توڑ دیتی ہے۔ زمانے کی اس بے حسی کو دیکھتے ہوئے کبھی کبھی انسان خود سے بھی خفا ہو جاتا ہے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی ایسا ہو جو اس کا حال پوچھے:

سنبھل کر بولنا مجھ سے ذرا تم
کہ اندر سے بہت ٹوٹا ہوا ہوں
کبھی مجھ سے مرا بھی پوچھ پیارے
میں خود سے آج کل روٹھا ہوا ہوں

آزادی دو طرح کی ہوتی ہے۔ جسمانی اور ذہنی۔ کسی کی تربیت اس طرح کریں کہ اسے دونوں راستے دکھا کر ذہنی آزادی دے دی جائے تا کہ وہ اپنے لیے خود صحیح راستے کا انتخاب کرے۔ اگر ایک راستہ بند کر دیا جائے اور دوسرے پر سختی سے چلنے کا حکم دیا جائے تو غلط ہو گا۔ انسانی فطرت ہے، اسے تجسس رہے گا کہ دوسرا راستہ کھولنا چاہئے۔ اس کے جتنے بھی نقصانات بتا دیے جائیں، اس لیے زنجیر میں جکڑ کر نہیں رکھا جا سکتا، وہ چاہے زنجیر جسمانی ہو یا سوچ کی، دونوں صورتوں میں باغی بنا دیتی ہیں۔ جس طرح کی آزادی کا مطالبہ آج کل کے دور میں کیا جا رہا ہے، وہ کہاں لے جائے گی؟......اپنے مقام سے گر کر دنیا کے قدموں میں:

سوچ کر ذرا چڑھنا تم خیال کی سیڑھی
گر یہاں قدم پھسلے چوٹ دل پہ لگتی ہے

غیر مسلم معاشرے میں عورت کا مقام دیکھیں یا پھر کشمیر کی بہنوں سے پوچھیں جن کی عصمت دری ہو رہی ہے۔ اپنی عزت بچانے کے لیے کوئی راستہ کھلا ملے، چاہے وہ موت کا ہی ہو۔

ہمارے مذہب اور معاشرے میں جس حد تک عورت آزاد ہے، اس پر کوئی پابندی لگائے تو ضرور آواز اٹھائے اور اپنا حق مانگے سے نہ ملے تو چھین کرلے۔ زمانہ کیا کہے گا؟ زمانہ کچھ نہ کچھ کہتا رہے گا اور جو اس سے ڈر گیا، سمجھو وہ مر گیا۔

لٰہذا زمانے کی پروا نہ کریں تو خاص فرق نہیں پڑے گا۔ بس اللہ کے بتائے ہوئے رستے پر گامزن رہیں تو کامیابی یقیناً آپ کے قدم چومے گی۔

29 نومبر 2019ء

ماسی کلچر

پنجابی زبان کا اسم ''ماسی'' ایک دور میں ''خالہ'' کو کہا جاتا تھا۔ ماں کی بہن ہونے کی وجہ سے کچھ عادات واطوار ماں سے مشابہت رکھتی ہیں، اس لیے بڑی عزت واحترام والا رشتہ سمجھا جاتا تھا۔ پھر جدیدیت کی ملاوٹ نے ماسی اور خالہ کا مکسچر بنایا جس سے آنٹی نے جنم لیا۔ ماسی کا عہدہ خالی ہوتے ہی گھریلو ملازمہ نے اس آسامی پر قبضہ جمالیا۔ ویسے تو یہ ناجائز قبضہ تھا لیکن اس کے خلاف کسی نے کوئی ایکشن نہیں لیا اور نہ اس لیے سوموٹو لینے کی ضرورت پیش آئی۔ نام کی مانوسیت کی وجہ سے کہیں کہیں اس نے اپنا بہت جلد مقام بنالیا۔ یہاں تک تو بہت اچھی بات تھی کہ ہر بندے کی عزت ہوتی ہے اور اس کا سب کو خیال رکھنا چاہئے لیکن ہر فائدے کے ساتھ نقصان بھی منسلک ہوتا ہے۔ جیسے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، اسی طرح انسانوں میں فرق ہوتا ہے۔ ایک وقت تھا جب لوگوں کا یہ موقف تھا کہ جس کا نمک کھائیں، جان دے کر بھی اس سے وفا کریں لیکن اب یہاں بھی دونمبری شروع ہوگئی ہے۔ نمک میں اثر نہیں رہا یا تاثیر بدل گئی۔ دوسری طرف یہ رواج پا گیا کہ اگر گھریلو خواتین ایک گھر میں تین چار بھی رہتی ہیں اور کمانے والا فردِ واحد ہے، تب بھی کام والی کا گھر میں آنا ضروری ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ ماسی کا بھی گھر ہوتا ہے، جسے وہ خود چلاتی ہے۔ اس کے علاوہ دس دس گھروں میں کام بھی کرتی ہے۔ کیا وہ انسان نہیں یا اس کی کوئی عزت نہیں؟ بس کام کرنا ہی اس کی ضرورت ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ماسی ہر گھر کی ضرورت نہیں بلکہ ایک فیشن بن چکا ہے جو معاشرے کو دو طبقوں میں تقسیم کرتا ہے۔ امیر اور غریب۔ درمیانہ طبقہ کہاں ہے؟ ان میں سے کچھ جان جوکھوں میں ڈال کر دن رات ایک کر کے محنت ومشقت سے امیر طبقے کی تمام رسومات ادا کر کے اس میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد ہر وقت تذبذب اور الجھن کا شکار کہ کہیں کچھ کمی نہ رہے، ورنہ پھر پسماندگی کا لیبل لگے گا اور جو ایسا نہیں کر سکتا، وہ غریبوں کی صف میں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ دوسرے نمبر والا آسان زندگی گزارتا

ہے۔اسے اونچے معیار کے لیے فضول دکھاوے کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی اور گھر کے کام خود کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی۔

ایک طرف مجبوری آجاتی ہے، ملازم پیشہ، جن کے پاس وقت کم اور کام زیادہ ہوتا ہے، بیمار اور بزرگ گھریلو امور احسن طریقے سے سرانجام نہیں دے سکتے یا بڑی فیملی یہ وہ لوگ ہیں جن کی ضرورت ہوتی ہے...... اسی طرح ایسی خواتین جن کے گھروں میں مرد نہیں ہوتے، بیوہ یا مطلقہ، ان کی مجبوری ہے گھروں میں کام کرنا۔بعض اوقات یہ مجبوری بہت بڑے نقصان کا باعث بنتی ہے۔اکثر اوقات وہ ہوس کا شکار ہو جاتی ہیں۔ان کے پیچھے باپ، بھائی اور شوہر کا ہاتھ نہ ہونے کی وجہ سے طاقت کے بل بوتے پر انہیں استعمال کیا جاتا ہے۔چوری چکاری کا الزام لگ جانے پر جاننے والوں میں سے انہیں کوئی کام نہیں دیتا۔بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر بہت کچھ سہہ کر لب کشائی نہیں کرتیں۔

کام کرنے والیاں بھی کسی خاص مقصد کے تحت آتی ہیں اور کروانے والیاں بھی شوقیہ کرواتی ہیں کیونکہ روزانہ گھر میں آنے والے فرد کو پوری فیملی کی روٹین کا علم ہوتا ہے۔کون کب گھر میں ہوتا ہے؟ ان کے ذرائع آمدن کیا ہیں؟ کس کے ساتھ کیسا سلوک ہوتا ہے؟ یہ معلومات ان کے لیے بہت مفید ہوتی ہیں جس کا تبادلہ خیال شعوری یا لاشعوری طور پر اپنی ہم منصبوں سے کرتی رہتی ہیں جو گھر والوں کے لیے نقصان کا باعث بنتی ہیں۔ڈکیتی جیسی وارداتوں میں یہ معمولات مدد دیتے ہیں، اسی لیے سب سے پہلا شک گھر میں آنے والوں پر کیا جاتا ہے جو جانتے ہیں کہ اس وقت گھر میں کتنے افراد ہیں؟ یا کون سی چیز کہاں ہے؟ اس ذخیرۂ معلومات کے تبادلہ خیال سے ایک دوسرے سے سیکھنے میں مدد ملتی ہے۔ ماسی ماہرِ نفسیات سے کم نہیں ہوتی۔ وہ مالکن کی ذہنی صلاحیت واستعداد کو مدِ نظر رکھ کر حسبِ موقع ردوبدل کی گنجائش کے مطابق مشورہ بھی دے ڈالتی ہے۔گھریلو معاملات میں دخل دینا، حسنِ اسلوب اور زبان وبیان کے اعتبار سے مختصر عرصہ میں اپنا دلدادہ کر لینا، پھر ان کی طرزِ معاشرت کی اصلاح کے لیے اپنے گراں قدر تجربات کے نچوڑ سے ذاتی اہداف کو سامنے رکھ کر مفید تجاویز پیش کرنا جن میں گھریلو مسائل کے حل کے لیے تعویز گنڈے، حسن کے نکھار کی کریمیں، وزن کم کرنے کے ٹوٹکے، دوسروں کی نظر میں باعزت وامیر بننے کے فارمولے، سستی شہرت کمانے کے فن، ان کے بعد خاندانی مشاورت میں بھی اپنا اہم

کردار ادا کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ رشتے کروانا بھی اب ان کی ذمہ داری ہے۔ ان کاموں کی ماہرین کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ تمام امور میں اپنا فائدہ ضرور سوچتی ہیں۔ اس درجہ کی کام والیاں فسادات کی وجہ بنتی ہیں۔

معاشرے میں بڑھتے ہوئے جرائم کو روکنے کے لیے اس طرح کے چالاک لوگوں پر نظر رکھنے کی سخت ضرورت ہے۔ جب گھریلو ملازمہ رکھی جائے تو اس کا شناختی کارڈ ضرور چیک کریں اور ایک عدد کاپی وصول کریں۔ بڑے شہروں میں کرائے کے گھروں میں رہنے والے آئے روز مکان بدلتے رہتے ہیں۔ یہ کاروبار ہر شہر میں رواج پا چکا ہے کہ جہاں کوئی واردات کرنا مقصود ہو، ان کے ملازمین سے سلام دعا بڑھاؤ، پھر کام آسان ہو جائے گا۔ ضروری نہیں کہ ملازم بری نیت سے معلومات دے بلکہ کچھ تو اپنے مالک کی بڑائی ظاہر کرنے کے لیے انہیں امیر کبیر بتاتے ہیں، اس لیے ان چیزوں کا خاص خیال رکھا جائے۔ ہمارے پاس ایک روشن مثال موجود ہے کہ ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے اپنا ہر کام کیا۔ یہاں تک کہ اپنے جوتے بھی خود مرمت کیے۔ یہ سب اپنی امت کے لیے کیا تا کہ کبھی ایسا کرنا پڑے تو اسے سنتِ نبویؐ سمجھ کر کرے نہ کہ شرمندگی محسوس کرتے ہوئے۔

آج سے اپنے اندر تبدیلی پیدا کریں۔ اس کا درس دوسروں کو دیں۔ جہاں تک رہا کام کرنے والیوں کا سوال، تو ان کے نخرے دیکھ کر نہیں لگتا کہ انہیں کام کی کمی ہے۔ ایک ماسی سے میں نے پوچھا کہ آپ سارے کام کسی ایک گھر کے کیوں نہیں کرتیں؟ اس کے جواب کے سامنے میری نفسیات فیل ہو گئیں۔ ''ہر گھر سے کچھ نہ کچھ لینا ہوتا ہے۔ ایک گھر سے لے کر دوسرے میں دکھایا کہ اس نے یہ دیا، پھر اگلے دن اس سے مانگ لیا تو تیسرے کو دکھا دیا۔ اگلے دن ان سے مانگ لیا اس طرح تنخواہ ساری بچ جاتی ہے۔'' اگر صدقہ خیرات ان لوگوں کو دیتے رہیں تو پھر مفلوج اور محتاج تک کچھ نہیں پہنچے گا۔ کام والی ماسی ان کے بھی حق کھا جاتی ہے۔ ہمیں خود سوچنا ہے کہ انہیں کام کی اُجرت مل جاتی ہے۔ کیا یہ مانگنے کا ایک بیہودہ ذریعہ نہیں؟ ہمارے غریب پڑوسیوں کے بارے ہم سے پوچھا جائے گا، اس وقت کیا جواب دیں گے کہ ماسی ہماری تعریفیں کر کے لے جاتی تھی اور اس طرح حق ادا ہو گیا۔ ایک بار کسی ماسی کی بیٹی کی شادی پر جانے کا اتفاق ہوا۔ دنیا جہان کی فضول چیزوں کا انبار لگا ہوا تھا جو اس نے مانگ مانگ کر جمع کر لی تھیں۔ اس کے بعد میں نے

سوچا کہ کیا ہم یہ نیکی کرتے ہیں کسی کے جہیز کے لیے کچھ مدد کر کے؟ جس چیز سے ہمارا اسلام منع فرماتا ہے۔

''جہیز لعنت ہے''......

پھر ہم لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ یہ کوئی اچھی چیز ہے، چاہے مانگنا بھی پڑے پھر بھی رسم ادا کرو۔ ہم کیوں وہ کریں جو دین کے خلاف ہو؟ ہمارے اردگرد لوگ کس درد اور تکلیف سے گزر رہے ہیں، ان پر لگائیں، نہ کہ اس خوشامدی ٹولے پر۔ بغیر چھان بین کے فرض ادا نہیں ہو گا۔ مستحق تک اس کا حق پہچانا ہمارا فرض ہے۔

12 دسمبر 2019ء

عیادتِ مریضاں

عیادتِ مریضاں کے سلسلے میں ''سکاؤٹس گروپ'' کی جانب سے ایک پروگرام منعقد کیا گیا جس میں سکاؤٹس کو نئے پاکستان کے پرانے شہر سرگودھا کے سول اسپتال کا نہ صرف دورہ کرایا گیا بلکہ انہی کے ہاتھوں مریضوں میں پھول اور اشیائے خورد و نوش تقسیم کر کے عیادت کا مفہوم سمجھانے کی کوشش کی گئی۔ یہاں حدیثِ پاک کا حوالہ دینا ضروری ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ایک بار ایک صحابیؓ کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور اُونٹنی سے اترے بغیر حال پوچھ کر واپس جانے لگے تو صحابیؓ نے اندر تشریف لانے کے لیے کہا۔ جس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ عیادت اتنی ہی ہوتی ہے۔ بے شک آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہر عمل میں امت کا خیال رکھا تا کہ اسے آسانی ہو مگر جو حال اسپتال میں دیکھا، ایسے لگا کہ کسی اور جہاں میں داخل ہو گئے ہیں۔ بچوں کے وارڈ میں خستہ حالی دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ ایک بیڈ پر دو دو مریض۔ یہاں کسی کو یہ فکر نہیں تھی کہ اس نے کیا پہنا؟ کب سے پہنا؟ اس کی رنگت کیسی لگ رہی ہے؟ دیکھنے والے کیا کہیں گے؟ کسی کو اپنی اونچی ناک کی پروانہ تھی۔ ذاتی خواہشات سے تمام تعلقات منقطع ہو چکے تھے کیونکہ یہ سب فکریں فارغ لوگوں کو گھیرے رکھتی ہیں۔ ان کی حالت دیکھ کر لگا جیسے قمر جلالوی نے انہی کے لیے کہا ہو:

کون پُرسانِ حال ہے میرا
زندہ رہنا کمال ہے میرا
میرے اعصاب دے رہے ہیں جواب
حوصلہ کب نڈھال ہے میرا
چڑھتا سورج بتا رہا ہے مجھے
بس یہیں سے زوال ہے میرا

جن فارغ لوگوں کے دل و دماغ میں اس طرح کے فتنے فتور جنم لیتے ہیں، ایسے لوگوں کا علاج

اس طرح کے وارڈ کا وزٹ کروا کر بھی کیا جاسکتا ہے جہاں ہر طرف درد، تکلیف اور ایک ہی خواہشِ شفا''تندرستی ہزار نعمت ہے''...... بیمار بچوں کے والدین پھولوں جیسے لختِ جگر کی تکلیف، دن رات کے یکساں معمولات، مالی مشکلات اور اہلِ خانہ سے دوری جیسے عوامل کی وجہ سے خاصے پریشان نظر آرہے تھے۔ عبرت حاصل کرنے کے لیے اسپتال چلے جائیں۔ امراض دیکھ کر لگا کہ ہم کتنے ناشکرے ہیں۔ ان کی جگہ ہم نہیں۔ کیا اس بات پر اس ذاتِ بابرکات کی نعمتوں کا شکر واجب نہیں؟ ہمارے دو ہمدردانہ بول سن کر ان لوگوں میں جیسے امید کی کرنیں پھوٹ پڑی ہوں۔ سماعتیں ایسے الفاظ سننے کو ترس رہی تھیں لیکن ان کے ووٹوں سے حکمرانی کے تخت و تاج کے مالک بننے والوں کے ضمیر میں چند سانسیں باقی ہوتیں تو عالی شان محلات میں سکون کی نیند نہ سوتے کیونکہ حضرت عمرؓ کا فرمان ہے کہ''اگر دجلہ کے کنارے بکری کا بچہ بھی پیاسا مر گیا تو اس کے لیے بھی عمرؓ جواب دہ ہوگا۔''ان حیرت کدوں کی طرف کسی کی توجہ کیوں نہیں جاتی؟ ایسے لوگوں کا حق کھانے والے انسانیت کے درجے سے بھی گرے ہوتے ہیں۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے لیڈروں کا پاکستان میں علاج ممکن نہیں تو ان مرداروں سے پوچھیں کہ لیڈر کے پیچھے پورے عوام ہوتے ہیں۔ کیا ان سب کو غیر ممالک علاج کے لیے بھیجا جاسکتا ہے؟ لیڈر کا یہ کام ہوتا ہے کہ ملک سے لوٹ مار کر کے بھاگ جائے اور عوام کو اپنے ملک میں ضروری سہولیات سے محروم کر دیا جائے، اس بات پر ایک جملہ یاد آیا''کوئی شرم ہوتی ہے، کوئی حیا ہوتی ہے''شاید یہ سب میں نہیں ہوتی۔

دوسرا مسئلہ ان مجبور لوگوں کا اپنا پیدا کردہ تھا۔ ایک مریض کے ساتھ چار پانچ لوگ رہ رہے تھے۔ گیلری میں ہر طرف بستر لگے ہوئے تھے۔ ان سے پوچھا کہ اتنے لوگ ساتھ کیوں رہتے ہیں؟ اس پر ایک اور عقدہ کھلا کہ اوپر کا کام یعنی عیادت کے لیے آنے والوں کا کھانا پینا اور چائے بوتل کا کام یہ کرتے ہیں۔ یہ قوم کب سلجھے گی؟ یہ اسپتال ہے یا ہوٹل؟ گاؤں کے لوگوں کا یہ کلچر بن گیا ہے کہ جب کوئی بیمار اسپتال میں داخل ہو تو پیچھے سے پورا گاؤں عیادت کیلئے پہنچتا ہے۔ کیا سنت صرف اسپتال میں پوری ہوسکتی ہے؟ لوگوں کا آنا جانا، اپنے ساتھ بچوں کو لانا، جن پر جراثیم آسانی کے ساتھ حملہ آور ہوتے ہیں، کتنا غلط ہے۔ ان سب باتوں کا شعور بھی دلوانا پڑے گا اس قوم کو......اور یہ کام حکومتِ وقت کا ہے کہ کوئی قانون بنایا جائے یا ڈاکٹر ہی اس مہم کا آغاز کر سکتے ہیں۔ وہ ان خطرات سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں اور ان کا پیشہ بھی یہی ہے۔ اس طرح

اسپتالوں میں فضول پھرنے والوں پر پابندی لگائی جائے۔ایسے معاملات سے آنکھ چرانا بھی پیشے سے وفانہیں یا پھر اسپتالوں میں بھی آرمی تعینات کرنا پڑے گی؟ ویسے ان کی حرکات دیکھ کر یہی لگا۔لوگ سگریٹ نوشی کررہے تھے۔کیااس کی اجازت ہونی چاہئے صحت کے مراکز میں؟ تھوڑی توجہ ادھر بھی دیں کہ احتیاط علاج سے بہتر ہے۔اگر ہم احتیاطی تدابیر اختیار کریں تو یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آدھی بیماریاں ختم ہوسکتی ہیں۔لہٰذا ڈاکٹر حضرات کو اپنے پیشے کے ساتھ وفا کرتے ہوئے تھوڑا ساوقت ادھر بھی دینا چاہئے۔صرف میڈیسن لکھ کر دینے سے فرائض پورے نہیں ہوجاتے۔ ہر چیز کا صدقہ ہوتا ہے۔حضرت علیؓ کا قول ہے کہ علم کا صدقہ یہ ہے کہ اسے دوسروں تک پہنچایا جائے۔صدقہ سمجھ کر ہی لوگوں کو بتادیں۔بھکاریوں کی آمدورفت......وہ ایک الگ اِشو ہے۔

تبدیلی تب آئے گی جب ہر انسان خود کو بدلے گا۔دوسروں کو ہم نہیں بدل سکتے لیکن اپنے آپ کو بدل سکتے ہیں۔آغاز اپنی ذات سے کریں تو تبدیلی ممکن ہے۔براہِ مہربانی جو جس عہدے پر ہے، اپنی ڈیوٹی کے پورے فرائض سمجھے۔اب چیف جسٹس ثاقب نثار نہیں جس سے ازخودنوٹس کی امید رکھی جاسکے۔

21دسمبر2019ء

فرقہ بندی ہے۔ اور کہیں ذاتیں!

خطبۂ حجتہ الوداع کے موقع پر نبی پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمام مسلمان بھائی ہیں۔ کسی کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر، عجمی کو عربی پر اور عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں، فضیلت صرف تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔ مسلمان ہونے کے ناطے ہمارا عقیدہ یہی ہے جو ہمارے نبی پاک ﷺ کی زبان مبارک سے نکالیکن انسان اپنی خواہش کے مطابق مطلب نکال لیتا ہے۔ سیاق وسباق کو چھوڑ کر جہاں قرآن وحدیث میں نقطہ مل جائے، اسے بنیاد بنا کر کہانی گھڑ کر اصل بات میں ترمیم کر لی جاتی ہے۔ جیسا کہ سورۃ الحجرات میں قبیلے کا ذکر آیا:

ترجمہ: ''اے لوگو! بے شک ہم نے پیدا کیا تم کو ایک مرد اور عورت سے اور کیا ہم نے تم کو کنبے اور قبیلے تا کہ ایک دوسرے کو پہچانو بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سے وہی زیادہ عزت دار ہے۔ جو زیادہ تقویٰ والا ہے بے شک اللہ علم والا اور خبر دار ہے۔'' (سورۃ الحجرات۔ آیت 13)

اس آیت کا درمیانی حصہ سب کو یاد ہوگا لیکن شروع اور آخری حصہ صرف تلاوت کے لیے ہی سمجھا جاتا ہے۔ ایک ماں اور ایک باپ کی اولاد ہونے سے سب کا مرتبہ یکساں ہے لہٰذا اپنی نسبت پر فخر کرنا اور دوسروں کو ذلیل سمجھنا جہالت ہے مگر پہچان کے لیے قبیلوں میں تقسیم کر دیا۔ اس تقسیم کا مقصد کمتر اور بدتر میں امتیاز کرنا نہیں کیونکہ اللہ کے نزدیک بزرگی تقویٰ میں ہے۔ شکل و صورت، عادات اور خصلتیں کچھ خاندان سے معلوم ہو جاتی ہیں مگر اعمال کا ان سے کوئی تعلق نہیں جس کی واضح مثالیں ملتی ہیں۔ آسیہؑ فرعون کی بیوی کے تعارف سے پہچانی جاتی ہے تو کنعان حضرت نوحؑ کا بیٹا ہونے کی وجہ سے۔ اس موضوع پر لکھنے کے پیچھے ایک مقصد ہے۔ جیسا کہ ہمارے ہاں نام کے ساتھ ذات بھی لکھ دی جاتی ہے۔ اس عمل سے بہت سی ذات و برادری کے افراد کسی مشہور برادری میں شامل ہونے لگے جس سے بہت سی برائیوں نے معاشرے میں جنم

لیناشروع کر دیا کیونکہ تعصب پسند معاشرہ اپنی روایات کو سامنے لا کر اسلامی تعلیمات کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے۔ یہی ہمارا المیہ ہے۔ گھر ٹوٹنے کے چند ایک واقعات سن کر محسوس کیا کہ اس پر قلم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس کاوش سے کوئی بڑے نقصان سے بچ جائے۔

ایک وقت تھا جب لوگ ''سید'' کہلوانے پر فخر محسوس کرتے اور خاص طور پر تشکیلِ پاکستان کے بعد بہت سے لوگ سید بن گئے۔ پھر ایسا موڑ آیا کہ سارا بہاؤ کھوکھر برادری کی طرف ہو گیا۔ ایسا کیا ہوا کہ سب اس ذات کے ہو گئے۔ اس کی ایک مختصر سی داستان جو ہم اپنے بڑوں سے سنتے آئے ہیں، وہ کچھ یوں ہے کہ حجاج بن یوسف نے جب اپنے بھتیجے محمد بن قاسم کو برصغیر بھیجا، اس کی فوج اپنی برادری یعنی مَلکوں پر مشتمل تھی۔ سندھ سے داخل ہوتے ہوئے ملتان تک پہنچ گئے۔ محمد بن قاسم کو واپس بلا لیا گیا لیکن ملتان چونکہ مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہو چکا تھا، اس لیے مَلک یہیں بس گئے جو راجپوت کھوکھر کہلوانے لگے۔ برصغیر زرعی ملک تھا اور کھوکھر زراعت سے نا آشنا، فوجداری کے سوا کچھ نہ جانتے تھے۔ یہاں چونکہ ریاستی نظام تھا، جب کوئی کمزور طبقہ کسی بڑے دشمن کا مقابلہ نہ کر سکتا تو وہ فوج کا دستہ منگوا لیتا اور اس کے بدلے مختلف شکلوں میں ملنے والا مالِ غنیمت ان کا ذریعۂ معاش ہوتا جن میں زمینیں بھی دی جاتیں۔ اس طرح مَلک جتھوں میں منقسم ہوئے تو کمزور طبقات کا حوصلہ بڑھا اور وہ مدد کے لیے انہیں بلانے لگے۔ ظالم اور جابر لوگوں کو مات ہونے لگی تو انہوں نے اپنی بربریت کو برقرار رکھنے کے لیے بادشاہِ وقت سے کہا کہ کھوکھر برادری کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے ہمیں خدشہ ہے کہ آپ کو سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ یہ سن کر حاکمِ وقت نے کھوکھر برادری کی طرف سے نظریں پھیر لیں جس سے حکومتی مراعات کم ہو گئیں لیکن ان کو بدستور معرکوں میں بلایا جاتا تھا۔ اس طرح مالِ غنیمت میں ملنے ولی زمینوں پر اپنے گاؤں بنا کر مختلف علاقوں میں آباد ہونے لگے اور انہی علاقوں کے نام ان کی پہچان بن گئے۔ اس طرح وہ کھوکھر کم اور گاؤں یا شہر کے نام سے پکارے جانے لگے لیکن کچھ گاؤں ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنا تشخص برقرار رکھا۔ یہ نہ صرف کھوکھر ہی رہے بلکہ اپنے گاؤں کے نام کے ساتھ بھی کھوکھر اں لگا دیا۔ اس طرح یہ ایک زمیندار برادری بن گئی اور زیادہ تر دیہی علاقہ جات میں مقیم ہو گئے۔ ملکی حالات خراب تر ہوتے گئے اور آخر کار حاکمِ ریاست مارا گیا۔ واللہ اعلم!

1980ء کی دہائی میں سندھ کی کھوکھر برادری نے ایک تنظیم بنائی جو 1990ء کی دہائی میں

''آل پاکستان کھوکھر ایسوسی ایشن'' کے نام سے پورے ملک میں پھیل گئی۔ جو اپنے گاؤں کے نام پر ذات بنا کر بیٹھے تھے، انہیں بھی اپنی کھوئی ہوئی پہچان دلائی۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان گاؤں میں جتنی بھی ذات کے لوگ رہتے تھے، سب کے سب ترتیب وار کھوکھر بن گئے۔ یہ رواج اتنا پھیلا کہ گاؤں کے وہ لوگ جن کو گاؤں والے کمی کہتے تھے، سب کھوکھر بن گئے اور انہوں نے اپنے رشتے داروں کو بھی کھوکھر بنا دیا، چاہے وہ جس ایریا میں بھی رہتے تھے۔ اب اس نقطے کی طرف آتے ہیں جس کی وجہ سے رقم الحروف کو اس پر قلم اٹھانے کی ضرورت پڑی۔ برصغیر میں رشتہ داری کے لیے ذات برادری کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا۔ گو کہ اب لوگ برادری سے باہر نکل آئے ہیں لیکن چھوٹی بڑی ذات کی تقسیم کی رسم اب بھی قائم ہے۔ (اللہ ہدایت دے سب کو)۔ ایک میرج بیورو والی محترمہ کا رجسٹر دیکھا جس میں ذات کے سامنے لکھا تھا، ''نائی کھوکھر''، ''مراثی کھوکھر''، ''مسلی کھوکھر'' اور ''جٹ کھوکھر''...... میں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ تو کہتی ہیں کہ یہ تفصیل پوچھنا ضروری ہوتا ہے۔ جٹ کھوکھر صرف جٹ کھوکھروں میں رشتے کرتے ہیں یا کسی اور جٹ برادری میں، باقی جس کا جہاں ہو جائے، کیونکہ پچھلے چند سالوں میں کئی ایک طلاقیں صرف ذات غلط بتانے کی بنا پر ہوئیں۔ پہلی بات ہے کہ اسلام کے مطابق یہ کوئی ناجائز کام نہیں کہ اگر کھوکھر نہیں تو بات طلاق تک پہنچ جاتی، البتہ جھوٹ کی وجہ سے انسان نہ صرف دوسروں کی بلکہ اپنی نظر میں بھی گر جاتا ہے اور جھوٹ بولنے والوں پر اللہ بھی لعنت بھیجتے ہیں۔

سب مسلمان برابر ہیں تو پھر اس فرسودہ رواج کو ختم ہو جانا چاہیے۔ جب کوئی گھر ٹوٹے، ان کے بچوں کو معاشرہ نفسیاتی مریض بنا دیتا ہے۔ کچھ ترس کھا کر، کچھ حقارت سے، دونوں صورتوں میں ان کا نقصان ہے۔ ایک جھوٹ سے طلاق جیسا گناہ الگ، اور اگر اتنے ہی متعصب سوچ کے مالک ہیں تو رشتہ جوڑتے وقت گاؤں سے تحقیق کروا لیا کریں۔ کھوکھر برادری زیادہ تر دیہاتوں سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک حدیث پاک ﷺ کا مفہوم ہے کہ اگر کوئی کسی سے رشتہ جوڑنا چاہے، اس کے لیے چھان بین کرے تو اسے سچ بتاؤ۔ اس کے پیچھے ایک وجہ طلاق سے بچانا بھی ہے۔ یہ تھا محرک اس کالم کا کہ ہو سکتا ہے میری اس کاوش سے کوئی گناہ سے بچ جائے، کوئی ذات پات کے چنگل سے نکل آئے، کوئی جھوٹ سے نکل کر سچ کا سامنا کرے۔ ورنہ کسی کے کھوکھر بننے سے مجھے کوئی مسئلہ نہیں اور نہ ہی کسی کی دل آزاری میرا مقصد ہے۔

26 دسمبر 2019ء

فیس بک پیغام رساں

اس دور میں زندگی کے آفتاب کی پہلی کرن انٹرنیٹ سے نمودار ہوکر دن کا آغاز کرتی ہے۔ جس طرح غذا وجود کی ضرورت ہے، اسی طرح نیٹ ذہن کے لیے توانائی فراہم کررہا ہے۔ اس نشے کا کوئی عادی ہوجائے تو پھر چھوڑنا مشکل ہوجاتا ہے۔ کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کا استعمال مضرِ صحت ہوتا ہے، کچھ کا فائدہ مند، لیکن نیٹ ان دونوں کے درمیان اس لیے ہے کہ اس میں اچھائی اور برائی دونوں پہلو پائے جاتے ہیں۔ یہ بذاتِ خود بُری چیز نہیں، اس کا استعمال اسے مفید یا نقصان دہ بناتا ہے۔ انٹرنیٹ سے دنیا سکڑ کر ہماری نظروں کے سامنے آچکی ہے۔ ہم جب چاہیں گھر بیٹھے انٹرنیٹ کے ذریعے کسی دوسرے ملک کی سیر کرسکتے ہیں۔ تمام علوم کی کتابیں پی ڈی ایف کی صورت میں مفت پڑھ سکتے ہیں۔ اگرچہ اس میں فوائدِ کثیر پائے جاتے ہیں مگر منفی استعمال بھی اپنی داستانیں چھوڑ رہا ہے بلکہ یوں کہنا درست ہوگا کہ اس کا ڈسا پانی بھی نہیں مانگتا۔ اپنی بات ایک میسج میں لکھ کر دوسروں تک پہنچانا آسان ہوگیا لیکن یہی میسج دوسروں کے لیے باعثِ تکلیف بھی بن رہے ہیں۔ جب کوئی پیغام تیزی سے پہنچانا ہو، اس پر لکھ دیا جاتا ہے کہ ثواب کی نیت سے آگے شیئر کریں یا شیئر کرنے سے شیطان آپ کو روکے گا۔ اس لائن پر عموماً وہ لوگ عمل کرتے ہیں جن کی سمجھ میں پوری پوسٹ میں سوائے اس لائن کے اور کچھ نہیں آتا کہ کس بات کا اجر ملے گا؟ اس میں لکھا کیا ہے؟ کچھ وال پر شیئر کردیتے ہیں۔ ہماری نئی نسل جو ابھی سکول سے فارغ التعلیم نہیں ہوئی، ان کے پاس بھی موبائل آچکے ہیں۔

دوسرا کم پڑھا لکھا طبقہ، تیسرے چھپے رستم، انہیں فیس بک پر میسنجر ہی کام کی چیز لگتی ہے۔ اس کے بغیر فیس بک کا تصور ہی نہیں، یا شاید وہ فری میں چلتا ہے کیونکہ میسنجر پر بار بار تنگ کرنے والوں کو جب کہا جائے کہ گروپ میں بات کریں یا وال پر تحریر پڑھیں تو بڑی معصومیت سے کہتے ہیں۔ ہمارے پاس نیٹ نہیں ہے۔ تاہم صرف میسنجر ہی استعمال کرسکتے ہیں۔ ان کے سوال ایسے

ہوتے ہیں۔ آپ کا نام کیا ہے؟ اندازہ کرو جب نام کا پتہ نہیں تو پھر فرینڈ ریکویسٹ کیوں بھیجی؟ پروفائل چیک کیے بغیر ریکوسٹ بھیج دین۔ ایسے بچوں کو والدین موبائل ہی کیوں دلواتے ہیں؟ جی! بچے ضد کرتے ہیں۔ بچے تو بچے ہوتے ہیں، ان کی ضد نہیں، فائدہ نقصان دیکھنا والدین کا فرض ہے۔ اس سے غفلت برتنا یا ان کی ہر خواہش پوری کرنا ذمہ داریوں سے راہِ فرار ہے۔ ان بچوں کی پشت پناہی اپنے پیج گروپ اور چینل چلانے والے طبقے کر رہے ہیں۔ وہ پوسٹ کو ایسے ترتیب دیتے ہیں کہ ''یہ دس لوگوں تک پہنچاؤ، کل تک خوشخبری ملے گی، ورنہ نقصان ہوگا''۔ خوشیوں کے طلبگار انہیں اندھا دھند فارورڈ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر نیک نیتی سے کوئی کام کر رہا ہے تو اسے اس طرح کی پوسٹ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ان کے چینل چل جائیں، تب بھی کمرشل نہیں لیتے جس کی مثال مولانا طارق جمیل کا چینل ہے۔ ایک دو اور بھائیوں کے بھی چینل ہیں جو کمرشل نہیں لیتے۔

ایک ویڈیو آئی جس پر تحریر تھا کہ ''یہ وظیفہ کرنے والا ایک ماہ میں پانچ کلو وزن شرطیہ کم کرسکتا ہے۔'' میں نے دیکھنا شروع کی۔ وہ تقریباً دس منٹ کی وڈیو تھی جس میں وظیفہ کیا بتایا گیا، ''نمازِ فجر کے بعد سورۃ فاتحہ سات بار اول و آخر تین تین بار درودِ پاک پڑھ کر خود کو دم کریں۔'' اگر مقصد یہ وظیفہ دوسروں تک پہنچانا تھا تو یہ تیس سیکنڈ کی وڈیو بنتی تھی جو بزرگ نے دس منٹ کی بنائی۔ اس کی نیت اللہ تعالیٰ کی ذات جانتی ہے لیکن انسان کو عقل بھی اسی ذات نے دی ہے۔ لہٰذا عقل رکھنے والے بھی جانتے ہیں یہ روحانی قلاش اسلام کا نام استعمال کر کے دنیاوی فائدے کا سوچتے ہیں۔ کیا ان سے پوچھا نہیں جائے گا کہ کچے ذہن کے بچوں پر کس طرح کے اثرات پڑ رہے ہیں ایسی چیزوں سے؟ کچھ ویڈیوز ایسی بھی ہوتی ہیں جن پر تحریر ہوتا ہے ''کسی نے اس وڈیو کو غلط کہا تو اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی''......کیا یہ ہیں ہمارے عقائد؟ اس پر افسوس اس بات کا ہے کہ جب غیر مسلم دیکھتے ہیں اسلامی وڈیوز، یا پوسٹ کے ویوورز زیادہ ہوتے ہیں تو وہ کوئی بھی بات لکھ کر اوپر'' نعوذ باللہ'' حدیثِ پاک لکھ دیتے ہیں، اس طرح کی پوسٹ سے میسنجر بھرا ہوتا ہے۔

ہمارے علمائے کرام کو ایک دوسرے پر فتوے لگانے سے فرصت نہیں کہ امتِ مسلمہ کہاں جا رہی ہے؟ ایک پوسٹ شیئر کر کے جنت خود پر واجب کر رہے ہیں۔ اپنے قیمتی وقت سے تھوڑا سا ان لوگوں کے لیے نکالیں جو ہر رکاوٹ دور کرنے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ ایسے ایسے عمل اور

استخارے جو نہ کبھی سنے نہ پڑھے۔ یہ کرتے ہیں میسنجر پوسٹ کرنے والے۔ اس کا خمیازہ مصروف لوگوں کو بھگتنا پڑتا ہے کہ تنگ آ کر بند کرنا پڑتا ہے۔ سب کے ساتھ یکساں سلوک، کچھ سیکھنے والے اور کچھ سکھانے والے بھی ہوتے ہیں، ان دونوں کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ اس طرح رابطے کے ایک آسان ذریعہ کو بند کرنا پڑتا ہے غیر ضروری پیغام بھیجنے والوں کی وجہ سے روزانہ کا سلام و دعا اور حال احوال پوچھنے والوں کی وجہ سے۔ اب اس پر کون نوٹس لے؟ کیا یہ کام بھی حکمرانوں کو کرنا ہے جو خود ان سے تنگ ہوتے ہیں۔

روزانہ کے گالی گلوچ کرنے والے زندگی کا روگ بن جاتے ہیں۔ لعن طعن پر اپنا قیمتی وقت ضائع کرنا حماقت ہے۔ اگر میسج اگنور کی آپشن لگا دی جائے تو شرمندہ ہونے کے بجائے کال شروع کر دینے والے اخلاق سے گری ہوئی حرکت کرتے ہیں۔ کسی کو بغیر اجازت کال کرنے پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن عقل مند کے لیے اشارہ کافی ہوتا ہے۔ جو اشارہ نہیں سمجھ سکتے، ان کے لیے لکھنا بے سود۔ اسی وجہ سے مجھے بھی میسنجر بند کرنا پڑا۔ اس یاس و قنوطیت کی ماری قوم کو اللہ تعالیٰ ہدایت دے کر صراطِ مستقیم دکھائے اور اپنے اور دوسروں کے وقت کی قدر کرنے کی توفیق دے۔

آمین۔

11 جنوری 2020ء

لوگوں کا کام ہے 'کہنا!'

اپنے حریف کا حملہ روکنے کے لیے مختلف دفاعی ہتھیار اور ذرائع کا استعمال کیا جاتا ہے جن میں سے بعض کو دیکھتے ہی مدِ مقابل ڈر جاتے ہیں اور کچھ کا نام ہی کافی ہوتا ہے۔ جب بات نام کی آئے، ساتھ ہی دماغ کے خفیہ گوشوں سے سوالات اٹھنا شروع ہو جاتے ہیں کہ کیا الفاظ بھی ہتھیار کا کام دیتے ہیں؟ جی بالکل...... ان کے حجم، وزن اور معنی سے ہم واقف نہیں ہوتے پر زبان زدِ عام ہونے پر ان کی اہمیت اور اثر پذیری کا علم ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک جملہ ہے ''لوگ کیا کہیں گے'' یا ''دنیا کیا کہے گی''۔ ہم نہیں جانتے کہ یہ کس کی ایجاد ہے پر بہت ہی بااثر ہے۔ اس ایک جملے نے زمانے کا جینا اجیرن کر رکھا ہے۔ اس کی خاطر انسان رات دن ایک کر دیتا ہے اور اپنی تمام تر توانائی صَرف کر کے اس کے دفاع میں اپنا تن من لگا دیتا ہے کہ اگر ایسا نہ ہوا تو لوگ کیا کہیں گے۔ یہ کہنے والے اپنی عقل کو بالائے طاق رکھ کر اسی دھن میں رہتے ہیں۔ مالک نے مخلوق کو آزمانا چاہا تو کائنات پیدا کی۔ اس ان گنت مخلوقات میں انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور باقی سب کو اس کے تابع کر دیا۔ انسان کو صرف اپنی بندگی کا حکم دیا لیکن انسان اپنی عظمت کو بھول کر مادی اشیا کی محبت میں گرفتار ہو کر دنیا کا غلام بن گیا۔ اس کے شوقِ آوارگی نے اسے اصل مقصد سے دور کر دیا۔ وہ اسی رکھ رکھاؤ کے گرد محوِ طواف رہتے ہیں اور کچھ لوگ پابہ زنجیر نہیں ہوتے۔ ان کی سبک رفتاری سے دنیا سمٹ کر آنکھ کے تل میں آ گئی۔ ان کی سوچ کی رفتار آواز کی رفتار سے بھی تیز ہوتی ہے۔

اس طرح یہ اپنی ذات کے حصار سے نکل کر ثریا اور ستاروں کی حدوں کو چھونے لگے۔ ان کے عزائم بلندیوں تک جا پہنچے۔ انھی کی وجہ سے باقی لوگ بڑی شان و شوکت، وقار اور اعتماد کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہوا میں اُڑنے کے خواب کو پورا کیا۔ چاند پر پہنچ کر دکھایا۔ دور افتادہ لوگوں سے کمیونیکیشن ممکن کی۔ اگرچہ یہ سب اللہ تبارک وتعالیٰ کے پہلے سے

طے شدہ پرگرام کے تحت ہوالیکن اللہ کے فضل کے ساتھ انسانی کاوش بھی شامل ہے۔ چاند کا کمان کی صورت سے لے کر مکمل ہونے تک سب میں انسان کے فائدے دریافت ہو چکے۔ ساکن اور بے جان زمین پر حیات کا آغاز کیسے ہوا، ابتدائی حالات سے آج تک کن کن مراحل سے گزرنا پڑا، دامنِ کہسار میں کتنی تہذیبیں دفن ہو چکی ہیں، شکمِ عرض میں قدرت کے بے بہا پوشیدہ قیمتی خزانے دریافت کر کے انسان نے اپنی زندگی کے رہن سہن کو کیسے بدل دیا؟ یہ سب خالق نے اپنی پیاری مخلوق کے لیے بنائے۔ ایک آدمؑ اور حواؑ کی اولاد کو آج کے دور میں دیکھیں تو مختلف علاقوں کی وجہ سے ایک دوسرے سے مختلف نظر آئیں گے۔ اسی طرح ہر علاقے کے خدوخال اور رسم ورواج مختلف۔ اگر قرہ ارضی پر نظر ڈالیں تو پہاڑوں کے انواع اور اقسام تک مختلف ہیں۔

ابتدائی دور میں خوردبینی کا علم نہ تھا اور رنگ وروپ کے زاویے معلوم نہ تھے۔ یہ انسان ہی ہے جس نے پہاڑوں، دریاؤں، کہساروں، کھیت کھلیان، چلتی ہواؤں اور رنگوں سے قدرت کے چھپے خزانوں کو دریافت کیا۔ سورج کی تمازت سے چاند کی روشنی تک کو انسان کے لیے فائدہ حاصل کرنے کا طریقہ بتایا۔ زمین کے ماحول کو دلربا اور زمانے کے چہرے کو حالات کے ہاتھوں خوبصورت بنا کر سنگلاخ چٹانوں کو کاٹ کر پھول اور پھل پیدا کرنے کے قابل بنایا۔ یہ سب اللہ کے فضل سے انسان کی محنت ومشقت کا ثمر ہے۔

دوسری طرف وہ لوگ آتے ہیں جو ان سب کارناموں سے انجان ہیں۔ ان کی زندگی میں ایسا کوئی پل نہیں آتا کہ وہ اس طرح کی چیزوں کے بارے میں سوچیں۔ نہ کوئی مقصدِ حیات نہ کائنات کے اسرار ورموز سے کوئی سروکار کہ کس چیز کو اللہ نے بنایا اور کس کو انسان کو عقل دے کر سکھایا۔ اگر فکر ہے تو صرف اس بات کی کہ لوگ کیا کہیں گے۔ ویسے تو اِس طرح کے لوگوں کے بارے میں کوئی اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کرتا، یہ محض اُن کے اپنے اندر کی آواز ہوتی ہے کہ وہ اپنے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ کھوکھلی شخصیت کے مالک اس دنیا پر کس مقصد سے آتے ہیں، یہ وہ خود بھی نہیں جانتے۔ ایسے لوگوں کی سوچ کا محور ان کی ذات ہوتی ہے۔ بس اسی کی فکر لاحق ہوتی ہے۔

لباس دوسروں سے اپنے وجود کو پوشیدہ رکھنے کے لیے پہنا جاتا ہے لیکن اِن لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ اُن کی سوچ اور شخصیت پر بھی خوبصورت پردہ پڑ گیا جبکہ ایسا نہیں ہوتا۔ بظاہر نظر آنا

دنیاوی مال و دولت کا ثبوت ہوسکتا ہے مگر باطن کا حال ان چیزوں سے معلوم نہیں ہوسکتا۔ان کی سوچ کے لشکر مقید رہتے ہیں۔ایسے لوگوں کو شعور دلانے کی اشد ضرورت ہے کیونکہ یہ ذہنی صحت مندی نہیں۔ان کی حرکات جب معاشرے میں ناپسند کی جاتی ہیں تو وہ طرح طرح کے دلائل دے کر خود کو صحیح ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ان کی شعوری کوششوں پر لاشعوری عادات پانی پھیر دیتی ہیں۔اس طرح کے حالات مایوسی اور تشویش پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں جو بڑھتے بڑھتے بے چینی اور نفسیاتی امراض کا سبب بنتے ہیں۔یہ نفسیاتی امراض جسمانی صحت پر اثرانداز ہونے لگتے ہیں۔

ذہنی اور جسمانی امراض کے درمیان حد مقرر کرنا مشکل کام ہے کیونکہ ہر انسان کسی نہ کسی تشویش میں مبتلا ہوتا ہے۔فرق صرف شدّت کا ہوتا ہے۔شدید کیفیت انسان کو بے کار اور مفلوج بنا دیتی ہے۔اس کی بے چین طبیعت اردگرد کے لوگوں کو بھی متاثر کرنا شروع کر دیتی ہے۔کاش کوئی ان کو چھوٹی چھوٹی خوشیوں پر خوش ہونا سکھائے کہ ایک ایک پل قیمتی ہوتا ہے اور ان میں کیسے جینا ہے۔

چلو کچھ خواب بنتے ہیں
حسیں موسم میں دل کو شاد کرتے ہیں
چلو دنیا نئی آباد کرتے ہیں
اگر دو پل خوشی کے مل گئے سمجھو
غنیمت ہیں
جھکا کے پھر کہیں نظریں
جھپک کے پھر کہیں پلکیں
بڑے ہی قیمتی یہ پل
نہ کھو دینا
کہ بھولے سے نہ رو دینا
یہ سپنے ٹوٹ جاتے ہیں
حسیں موسم تو اکثر روٹھ جاتے ہیں

اسی کو زندگی سمجھو

اسی اک پل میں جی لینا

یہی اک لمحہ کافی ہے

یہی پل یاد رکھنا تم

اسی سے دل کو پھر آباد رکھنا تم

چلو کچھ خواب بنتے ہیں

افسوس کہ ہمارے معاشرے میں ایسے لوگوں کو بیمار سمجھا ہی نہیں جاتا، اس لیے نہ تو ان کے علاج معالجے کی طرف توجہ دی جاتی ہے اور نہ ہی ان کو اس چیز کا احساس ہو پاتا ہے کہ وہ خود سے زیادہ دوسروں کے لیے پریشانی کا باعث بنتے ہیں۔ ان کے ساتھ رہنے والے مسلسل اذیت اور الجھن کا شکار رہتے ہیں کہ کب کیا بول دیں۔ جن کو ایسے بے اصول لوگوں کے ساتھ طویل عرصہ رہنا پڑے، ان کی اپنی ذات دب کر رہ جاتی ہے۔ اس کشمکش کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ خود سے بھی خفا خفا رہنے لگتے ہیں۔ ایسی زندہ نعشوں کی ہمارے ہاں کمی نہیں۔ اس طرح کے لوگوں کا مثبت ذہنی صحت کے اصولوں کے مطابق علاج کروانا چاہیے ورنہ اپنے ساتھ دوسروں کا جینا بھی حرام کیے رکھتے ہیں۔ تشویش اور خوف سے فشارِ خون بڑھ کر نبض کی رفتار تیز کر دیتا ہے۔ جس سے بڑے عارضے لاحق ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے زمانہ صرف اتنا ہی کہتا ہے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون۔

21 فروری 2020ء

اطمینانِ قلب

انسان جس معاشرے میں رہتا ہے، انسانی فطرت اس سے مطابقت نہ بھی کرے تو کچھ باتوں کو اپنانا پڑتا ہے کیونکہ وہ اکیلا زندگی نہیں گزار سکتا۔ گود سے گور تک دوسروں کی مدد درکار ہوتی ہے۔ اس سفر میں کسی موڑ پر بے لوث محبت کرنے والے بھی ملتے ہیں جن کا مقصدِ حیات اللہ کا ذکر ہوتا ہے۔ لیکن ذکر کیا ہے؟ ان کا نظریہ عام لوگوں سے مختلف ہوتا ہے۔ اگر اس لفظ کے لغوی معنی دیکھے جائیں تو ذکر کا مطلب ''زبان اور دل سے کسی کو یاد کرنا'' ہے۔ اگر ذکر کے ساتھ اچھائی آئے تو اچھا ذکر جیسا کہ ذکرِ اللہ (اللہ کا ذکر) اور اگر برائی آئے تو برا ذکر، ذکرِ عدو (کسی کو برائی کے ساتھ یاد کرنا)۔ آج کے دور میں دیکھیں تو اول الذکر میں ہم پورا نہیں اترتے البتہ دوسرا ذکر دل و دماغ سے کرنے کی وجہ سے بہت مؤثر ثابت ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ بھگتنا پڑتا ہے۔ جب کسی شخص سے عداوت ہو جاتی ہے تو اٹھتے بیٹھتے، نہ چاہتے ہوئے بھی اسی کے خیال کی زنجیریں ہمارے دماغ کو مقید رکھتی ہیں۔ بظاہر اپنے کاموں میں مشغول ہو کر بھی اسی نقطے پر منجمد رہتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال سنگین اور ضرر رساں ثابت ہوتی ہے۔ یہاں سے منفی سوچ کا آغاز ہوتا ہے۔ طبقاتی تقسیم کے لحاظ سے انسان جس طبقے سے تعلق رکھتا ہے، اس میں پائی جانے والی برائیوں کو گلے لگانا شروع کر دیتا ہے۔ غصہ، مجبوری، بے بسی، بھوک، کمزوری اور مایوسی مل کر اس طرح حملہ آور ہوتی ہیں کہ متاثرین کو بند گلی میں لا کھڑا کرتی ہیں اور سب سے پہلا وار ان کی اپنی جسمانی، ذہنی اور روحانی صحت پر پڑتا ہے۔ منفی تعصب کے شکار لوگ جب علاج کے لیے ڈاکٹر یا مذہبی شخصیت کے پاس جاتے ہیں تو وہ ان مریضوں کی ہسٹری سے واقف نہیں ہوتے ہیں۔ اس لیے ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وقتی طور پر دوا بھی اثر کرتی ہے لیکن ذہن میں اٹھنے والے فتور کو ہمیشہ کے لیے ختم نہیں کر سکتی۔

سب سے پہلے تو تشخیصِ امراض ضروری ہے جس کے لیے سچ بولنا پڑتا ہے۔ چونکہ سچ کڑوا ہوتا

ہے، اس لیے کم لوگ اسے پسند فرماتے ہیں۔ اب آتے ہیں اپنی امراض کی طرف کہ ان کی تشخیص کیوں نہیں ہو پاتی؟ برِصغیر کی تہذیب پوری دنیا سے مختلف ہے۔ اس کی ایک وجہ یہاں آباد قومیں ہندو اور سکھ کثیر تعداد میں ہیں اور یہ دونوں اہلِ کتاب نہیں۔ اس لیے ان کی تہذیب اہلِ کتاب سے بہت مختلف ہے۔ ان کے ساتھ رہتے ہوئے مسلمانوں کو جہاں سہولت نظر آئے، وہاں وہ علاقائی ثقافت کا نام دے کر اپنا لیتے ہیں۔ اسی لیے توہمات اور شرک جیسے عناصر یہاں کے مسلمانوں میں رواج پا چکے ہیں۔ رہن سہن اور ماحول کچھ ایسا ہے کہ کوئی انسان انفرادی زندگی اپنی مرضی سے نہیں گزار سکتا ہے۔ بلاوجہ کی روک ٹوک، تنقید برائے تنقید، دوسروں سے آگے نکلنے کی خواہشات اور بڑھتا ہوا منفی رجحان کیسے اضطراب پیدا کرتا ہے، اس کی ایک چھوٹی سی مثال دینا چاہوں گی۔ ایک انسان جب اپنے کسی ناپسندیدہ شخص کے پاس اپنی پسند کی چیز دیکھتا ہے جس سے وہ محروم ہے، تو یہ اس کی برداشت سے باہر ہو جاتا ہے۔ غصہ کی حالت میں اس کا خون گرم ہو کر ہائی بلڈ پریشر کا باعث بنتا ہے۔ ایسے مریض کو جب معالج کے پاس لے جایا جائے گا تو وہ بلڈ پریشر کو وقتی طور پر کنٹرول کرنے کی دوا دے گا جس سے مرض میں آفاقہ تو ہو گا لیکن اس کے اندر کا اضطراب ختم نہیں ہو گا جب تک کہ اندرونی کیفیت کو بیان نہیں کیا جائے گا۔ کوئی کیسے سمجھ سکتا ہے کہ مسئلہ کہاں ہے؟ اگر ہمت کر کے کوئی کسی قریبی کو روداد سنا بھی دے تو وہ سونے پر سہاگہ کر دیتے ہیں۔ انہیں یہ احساس نہیں دلایا جاتا کہ آپ کی ذہنی حالت درست نہیں، جو آگے آپ کے لیے خطرات کا باعث بن سکتی ہے اور اس میں نقصان آپ کا اپنا ہو گا۔ دوست وہی ہوتا ہے جو ہمیشہ آپ کے فائدے کی بات کرے لیکن یہاں کہانی رخ بدل لیتی ہے۔ اپنے سکون اور دوسروں کی تباہی کے لیے کسی آستانے کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ جہاں قدم رنجہ فرماتے ہی ایمان اپنا رختِ سفر باندھ لیتا ہے۔ جو نہیں نہیں مانتے، وہ طاقت کے بل بوتے پر مدِ مقابل کو اپنی حیثیت کے مطابق نقصان پہنچانے کی تگ و دو کرتے ہیں۔

یہ دونوں راستے ایک ہی سمت یعنی ظلمت کی طرف لے جاتے ہیں۔ تنویر کی کرنوں سے بے نیاز دل و دماغ کے لیے رب تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ اندھے، گونگے اور بہرے ہیں کیونکہ ان کے دلوں پر مہر لگ چکی ہوتی ہے۔ بظاہر دیکھنا، سننا اور بغیر سوچے بولنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اسی لیے قرآنِ پاک میں متعدد بار اللہ کے کلام پر غور کرنے کا حکم ملتا ہے۔ سورۃ النساء میں ارشاد ہوا۔

ترجمہ: ''پھر جب تم نماز ادا کر چکو تو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے رہو اور جب اطمینان پاؤ تو نماز قائم کرو۔ یقیناً نماز مومنوں پر مقررہ وقتوں پر فرض ہے۔''

(سورۃ النساء، آیت نمبر 103.)

اس آیت پاک کی روشنی میں دیکھیں تو کیا ہمارے ذِکر و اذکار ایسے ہیں؟ مخصوص وقت میں تسبیح پکڑ کر بیٹھنے کو ذِکر سمجھا جاتا ہے جبکہ اٹھتے، بیٹھتے، لیٹے سے مراد وہ لوگ یہ مطلب لیتے ہیں کہ جو کام بھی کیا جائے، اس میں اللہ کی رضا جائز و ناجائز اور حکمِ خداوندی کو مدِ نظر رکھا جائے۔ اس معیار پر جو فعل سرزد ہو گا وہ ذِکرِ الٰہی ہو گا کیونکہ اس میں اللہ کی خوشنودی مقصود ہے اور وہ نیت دیکھتا ہے، دکھاوے کی نماز بھی اسے پسند نہیں۔

اب دوسرے گروہ کی طرف آتے ہیں جو صرف زبان کے الفاظ کو ہی ذکر سمجھتے ہیں۔ اسی سے برکتوں رحمتوں کے نزول کی امید لگا کر بیٹھے ہوتے ہیں۔ زبان پر الفاظ ہوں گے:

''الا بذکر اللہ تطمئن القلوب'' (13:28)

ترجمہ: ''اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔''

ہاتھ میں ترازو جس میں وزن کا ہیر پھیر، اصل میں نقل ملا کر بیچنا، جس کے ہاتھ میں قینچی اس کا بھی یہی حال، اگر قلم ہے تو وہ بھی ذکر سے مطابقت نہیں رکھتا...... کہیں سے سنا کہ اس آیتِ مبارکہ کا وظیفہ کرنیوالوں کی دلی مراد پوری ہوتی ہے تو شروع کر دیا''

''رب ارحمھما کما ربینی صغیرا'' (17:24)

ترجمہ: ''اے میرے پروردگار ان پر ویسا ہی رحم کر جیسا انہوں نے میرے بچپن میں میری پرورش کی۔''

اور ان کے بوڑھے والدین فٹ پاتھ پر بیٹھ کر اپنے کانپتے ہاتھوں سے کسی کی دی ہوئی روٹی پکڑ کر بھوک مٹا رہے ہوتے ہیں۔ اسی طرح کئی مثالیں ملیں گی۔ وظیفہ بتانے والوں کی دست بوسی ہو رہی ہوتی ہے کہ ان کا بتایا ہوا وظیفہ ضرور مراد پوری کرے گا۔ انہیں تحفے تحائف سے نوازا جا رہا ہوتا ہے کہ سب ان کی دعا کے مرہونِ منت ہوا ہے۔ بے شک اللہ کے کلام میں برکت ہے لیکن یہاں تو قول و فعل میں بھی تضاد ہے۔ بات یہاں ختم نہیں ہو جاتی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے

کہ جو زبان پر ہو، اس پر عمل دیکھنے کو بھی ملتا ہے۔ انسان یا ملائکہ ظاہر کو دیکھتے ہیں جس سے دوسروں کے قول وفعل میں تضاد یا مماثلت کا تخمینہ لگایا جاتا ہے۔ لیکن اللہ کی ذات تو نیت دیکھتی ہے۔ اس کے لیے اتنا کافی نہیں ہوتا کہ ہم کیا کر رہے ہیں؟ یہ معنی رکھتا ہے کس مقصد کے لیے کر رہے ہیں۔ یہ علم غائب ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جب تک دل سے اس کو مان نہیں لیتے کہ اس کے حکم کے بغیر اپنی ایک سانس مکمل نہیں کر سکتے، تب تک علاج ممکن نہیں۔ اس لیے اپنے اندر خود جھانکنا پڑتا ہے۔ دل کی باتیں دل ہی جانے اور نہ جانے کوئی...... اپنے طبیب بن جائیں...... ضمیر کو جج بنا دیں۔ جب اندر انصاف ہوگا تو کائنات ہی بدل جائے گی۔

29 مارچ 2020ء

آخری بات

اللہ تبارک وتعالیٰ جب انسان کو بے شمار نعمتوں سے نوازتا ہے تو اس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ دقیق مطالعہ کی بنیاد پر اپنی فطری خوبیوں کے نکھار سے استفادہ کرتے ہوئے دوسروں کے لیے مشعلِ راہ بنے۔ اپنی ذات کا جائزہ لینے کا مطلب یہ نہیں کہ انسان ہر وقت حقائق سے بے نیاز تخیلات کی وادیوں میں ہی بھٹکتا پھرے یا ریشم کے کیڑے کے مانند اپنے خول میں خود کو محصور کر لے۔ بلکہ اپنے آپ سے آگاہی اس لیے بھی لازم ہے کہ مستقبل میں آپ زندگی کا لائحہ عمل مرتب کر کے اپنے اندر جنم لینے والی منفی اور مثبت قوتوں کو محاذ آرائی سے باز رکھنے میں کامیاب ہو سکیں اور یہ محض اس صورت میں ممکن ہو گا جب آپ اپنی صلاحیتوں سے بخوبی واقف ہوں۔ اس طرح آپ نہ صرف اپنے بلکہ دوسروں کے لیے بھی کچھ کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

سب سے پہلے احساس پیدا ہوتا ہے۔ انسان جس ماحول، معاشرے اور تہذیب میں رہتا ہے، اس پر سوچنے لگے تو سوالات اٹھتے ہیں۔ ان کے جوابات کی تلاش کی تحریک پیدا کرتی ہے۔ جب یہ جذبہ جنون میں بدلے تو فن پارے تخلیق ہوتے ہیں لیکن ہر فن کا عنصر فنکار میں فطری طور پر پایا جاتا ہے کیونکہ جب مصنف قلم سے قرطاس پر اپنی سوچ کے نگینے بکھیرتا ہے تو اس سے پہلے وہ کئی مراحل سے گزر چکا ہوتا ہے۔ یہ فطری عمل پیدائشی ہے جو اندر ہی اندر اضطراب پیدا کرتا رہتا ہے لیکن ذہنی بلوغت کے بعد منظرِ عام پر آتا ہے۔ گردونواح میں دوسروں پر اثر انداز ہونے والے عوامل کا بخوبی جائزہ لے کر خود کو متاثرین میں شامل کرنا ہر فنکار کا خاصہ ہے۔ طوفانوں کے ہم مزاج فنکار تھکن کی چادر اوڑھ کر سونے سے اپنے لہو سے خوشیوں کے چراغ جلانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہم عصر کرب انگیز سچائیوں کی ترجمانی بلا تفریق، ذات پات، رنگ ونسل اور قوم وقبیلہ سے بے نیاز ہو کر بیان کرنا اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہیں۔ اس عہد کے ظلم وستم اور ناانصافیوں کے خلاف ہر رسمِ بغاوت نبھانے کو تیار رہتے ہیں۔ کچھ اہلِ علم کو اپنے علم پر بڑا زعم ہوتا ہے جبکہ علم وفراست ان

چیزوں کا شعور دیتی ہیں جنہیں ہم دیکھ، سن اور چھو سکتے ہیں۔ جہاں عقل رسائی نہیں دیتی، وہاں سے احساس کی حد شروع ہوتی ہے۔ علم جاننے کا نام ہے۔ جب یہ عمل بن کر انسان میں اترے تو عرفان پیدا ہوتا ہے۔ قرآنِ پاک میں حساس لوگوں کے لیے پچھلوں کی کہانیاں سبق آموز ہیں۔ دوسرے گروہ کے لیے اچھائی اور برائی کے درمیان ایک حد مقرر کی گئی ہے جبکہ تیسرے گروہ کو جہنم کی آگ سے ڈرایا گیا۔ انسان جب محسوسات کے ذریعے دنیا کو اپنے اندر اتار کر باہر دیکھتا ہے تو نظارہ کچھ اور ہوتا ہے۔ اس میں 'میں' کہیں نہیں ہوتی، تاحدِ نگاہ 'تو' ہی 'تو' نظر آتا ہے۔ انہی جذبوں نے رقم الحروف کو احساسات کی زنجیروں میں جکڑے لوگوں کی ان کہی داستانِ غم رقم کرنے پہ مائل کیا۔ اگرچہ ادبی آغازِ سفر شاعری سے کیا لیکن اس کینوس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لگا کہ نظم سے نثر میں بات سمجھانا قدرِ آسان ہے تو افسانہ لکھنا شروع کیا، جسے حلقۂ احباب نے بہت سراہا۔ ان کے حوصلہ افزا الفاظ نے دیگر اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ترغیب دلائی۔ ارشد محمود ارشدؔ کے مجموعۂ کلام 'تبصرہ' سے باقاعدہ اشاعت کا آغاز کیا۔ روزنامہ ''تجارت'' کے ایڈیٹر نے میرے کالم کو اپنے اخبار میں جگہ دی۔ پھر سوشل میڈیا کے توسط سے دیگر میگزین اور اخبارات میں کالم شائع ہونے لگے تو کچھ سینئر صحافیوں نے مشورہ دیا کہ کسی ایک اخبار کا انتخاب کریں اور ماہانہ، ہفتہ وار یا روزانہ کی بنیاد پر اسی کے لیے لکھنا شروع کریں۔ ایک ٹی وی پروگرام میں جناب اوریا مقبول جان سے مزید رائے طلب کی تو انہوں نے بھی یہی نصیحت کی۔ تب میں نے روزنامہ ''جرات'' لاہور کا انتخاب کیا اور غضنفر کاظمی کو متواتر ہفتہ وار کالم بھیجنے لگی جو پیر کے روز شائع ہونے لگا۔ جب یہی کالم اپنے گروپ ''خاموش گفتگو'' میں پوسٹ کیے تو انکشاف ہوا کہ لفظ کہیں نشتر کا کام کرتے ہیں تو کسی کے لیے مرہم بن جاتے ہیں کیونکہ ہمارے معاشرے میں کوئی غلط کام رواج پا جائے تو اس طوق کو گلے سے نکالنا آسان نہیں ہوتا۔ کئی لوگ ایسے ملے جو یہ سب کہنا چاہتے مگر لب کشائی کی ہمت نہیں ہوتی۔ ایک برائی جو عام ہو چکی ہے، وہ دوسروں کی غلط رہنمائی کرنا ہے، اس طرح اپنے گناہوں کے ساتھ دوسروں کے گناہوں کے بوجھ بھی اٹھاتے ہیں کہ اوروں کو درست مشورہ نہ دینے والے اس جرم میں برابر کے شریک ہوتے ہیں لیکن یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ بدعنوانی نہ صرف اداروں اور چیزوں میں ہوتی ہے بلکہ جذبوں میں بھی شامل ہو چکی ہے۔ ان مضر عناصر سے معاشرے کو پاک کرنا بھی اہم فریضہ ہے جن کی وجہ سے مہیب خیالات

پریشان کیے رکھتے ہیں۔ یہ کام اگرچہ فردِ واحد کا نہیں، لیکن ابتدا کسی ایک کو کرنا پڑے گی۔ جن کی صراطِ مستقیم پر چلنے کی خواہش ہو، وہ بھی انتظار میں رہتے ہیں کہ کوئی لے کر جائے ورنہ لوگ کیا کہیں گے۔ غلط راستے کا قوی یقین ہو، تب بھی دنیا داری نبھانا ان کی مجبوری ہے۔ انھی بے بنیاد اور فرسودہ رسموں سے عاجز آ کر اپنی بساط کے مطابق اس کارِ خیر میں حصہ لیا تو بہت سے لوگوں کو لگا کہ یہ ان کی کہانی ہے کیونکہ ادب زندگی سے تخلیق ہوتا ہے اور جب آنکھوں دیکھا لکھا جائے تو کسی نہ کسی کی کہانی ہوتی ہے جس سے وہ چھٹکارا پانا چاہتے ہیں۔

انسان کو اپنے اندر لچک ضرور رکھنی چاہئے کیونکہ سیکھنے کا عمل تا حیات جاری رہتا ہے۔ تبدیلی کا آنا وقت، علم اور تجربے کے ساتھ لازمی ہے۔ بہتر سے بہترین کی طرف سفر روزِ ازل سے جاری ہے لہٰذا کسی ایک نقطے پر منجمد ہو جانا عقل مندی نہیں لیکن یہاں بھی میانہ روی اختیار کرنی چاہئے۔ بار بار پینترے بدل کر انسان اپنا اعتماد کھو بیٹھتا ہے اور ہم اس طرح کے امراض میں خود کفیل ہیں۔ دوسروں کی تائید و تحسین حاصل کرنا ایک فطری عمل ہے۔ اگر یہ منفی رخ اختیار کر جائے تو اپنی کامیابی سے دوسرے کی ناکامی باعثِ مسرت ہوتی ہے جس سے بدترین اور سنگین جرائم کا آغاز ہوتا ہے۔ پھر حسد کی آندھی انتقام کے شعلوں کو ہوا دے کر، مزید بھڑکا کر نہ صرف اوروں کے لیے خطرے کی گھنٹی بجاتی ہے بلکہ اپنے تن من کو بھی اسی بھٹی کا ایندھن بننا پڑتا ہے۔ یہ ہر شعبۂ زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ چاہے وہ کھیل کا میدان ہو یا سیاست کا ایوان، تجارتی منڈی ہو یا مذہبی گروہ بندی، کوئی بھی اس مقابلے میں پیچھے نہیں۔ ہم کیا ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟ کدھر کا رخ ہے؟ اس پر نظرِ ثانی وقت کی ضرورت ہے۔ اپنے مقاصد کو مخفی رکھ کر غلط تصویر دکھانا، یہ چھپن چھپائی کا کھیل انسانیت میں ممنوع ہے جو بڑے شوق سے کھیلا جاتا ہے۔ طعن و تشنیع کی پروا کیے بغیر منزل کی طرف گامزن رہنا اصل فلاح ہے۔ جو راستے میں الجھ جاتے ہیں، ان کے خواب کبھی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ پاتے۔ ہم مقصدِ عظیم لے کر اس جہانِ فانی میں آئے ہیں جس میں کامیابی پر چاندنی کا جلوس استقبال کے لیے تیار کھڑا ہے۔ اب انسان پر منحصر ہے کہ وہ اس دائمی تمغۂ حسن کو اپنے گلے لگاتا ہے یا وقتی نمود و نمائش کو اپنے لیے سب کچھ سمجھتا ہے۔ مسلمانوں کے پاس زندگی گزارنے کا مکمل نصاب قرآن و حدیث کی صورت میں موجود ہے جس میں انسان کی تخلیق کے تمام مراحل کو صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔ تمام کائنات کا علم انسان کو اس وقت دیا گیا، جب

خوردبین کا وجود تک نہ تھا۔ تخیل کی زرخیزی عطا کر کے اس کو عملی جامہ پہنانے کو عقل کی دولت سے نوازا لیکن انسان ان سب کو بھول کر آج فکرِ معاش کے چنگل میں پھنسا ہے۔ انواع واقسام کی ایجادات کے باوجود، یہاں تک کہ سائنس آج بامِ عروج پر پہنچ چکی ہے، پھر بھی انسان کو سکون میسر نہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ کہیں ہم راستے سے بھٹک چکے ہیں؟ جب خالقِ کائنات نے بتا دیا کہ سکون کہاں ہے تو وہیں ملے گا۔ جب اللہ نے کہہ دیا کہ سکون اس کے ذکر میں ہے تو پھر اس کے سوا سکون نہیں مل سکتا۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کا ذکر کیا ہے؟ یہ ایک وسیع موضوع ہے لیکن ہم نے اسے محدود کر دیا ہے۔ اللہ کا ذکر ہر اچھی بات میں ہے۔ کسی کو تکلیف سے بچانا، کسی کو غلط کام سے روکنا، کسی کے کام آنا، یہ سب کام اللہ کے ذکر میں شامل ہیں کیونکہ مقصد اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ مصلا بچھا کر، ہاتھ میں مالا پکڑ کر بیٹھ جانا ہی اللہ کا ذکر نہیں ہوتا بلکہ جہاں ضرورت ہو، وہاں مثبت کردار ادا کرنا بھی ذکرِ الٰہی میں شامل ہے۔ لہٰذا صرف تلاوتِ قرآنِ پاک اور اسمِ عظم ہی ذکرِ الٰہی نہیں بلکہ مخلوقِ خدا کی فلاح کی ہر بات بھی ذکر میں آتی ہے۔ یہ تو ایک مثال ہے۔ ورنہ ہر جگہ من گھڑت کہانیاں ہیں جن کی وجہ جانے بغیر مانتے چلے جا رہے ہیں اور اپنی زندگی کو مشکل ترین بنا لیا ہے۔ ان پر غور وفکر ہر انسان کا حق ہے۔ بہت سے مشائخ، علما اور ادیب اس پر کام کر رہے ہیں۔ چونکہ صحیح علم کو دوسروں تک منتقل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے، اس لیے جہاں تک میری آواز جا سکتی ہے، میں نے پہنچانا ضروری سمجھا تا کہ عام قاری تک بات سادہ اور آسان الفاظ میں پہنچ پائے۔ آغازِ سفر سے انجام کو سامنے رکھنا چاہیے۔ جب منزل مل جائے تو راستے کی مشکلات بھول جاتی ہیں۔ اخبارات کی زینت بننے والے کالموں کو جب کتابی شکل دینا چاہی تو حلقۂ احباب نے بھرپور معاونت فرمائی جس کی وجہ سے یہ کام بطریقِ احسن پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔

الحمدللہ!

2 مئی، 2020ء

---تمت بالخیر---

اینڈ سائنس بحیثیت استاد کیا اور 6 برس تک اس سے منسلک رہیں۔ دریں اثنا آپ نے درس و تدریس کے بیش تر تکنیکی شعبوں کے بارے میں علم حاصل کیا۔ ان میں متعدد کا تعلق کمپیوٹر کی مہارت، سافٹ ویئر، پروگرامز اور انفارمیشن ٹیکنالوجی سے ہے۔ اس طرح محترمہ کنیز بتول اپنی تدریسی سرگرمیوں میں جدید تکنیک کا ہر ممکن حد تک استعمال آج بھی جاری و ساری رکھے ہوئے ہیں۔ انہیں مقامی و قومی زبانوں کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی مکمل عبور حاصل ہے۔

انہوں نے 2012ء میں انسٹی ٹیوٹ آف ماڈرن ٹیکنالوجی اسلام آباد سے ڈپلومہ برائے ''صحت کی نگداشت کا اسلامی طریقہ'' بھی حاصل کیا اور اپنے علاقے میں سوشلائٹ صحت مرکز کی بنیاد رکھی۔ اس مرکز سے خواتین کے ذہنی صحت کے مسائل اور ان کا مؤثر حل گھریلو، خاندانی اور سماجی تناظر میں بتایا جاتا ہے۔ اب یہی سلسلہ ذاتی ''یوٹیوب چینل'' کے ذریعے کامیابی سے جاری ہے

ایک معلمہ ہونے کے ناطے بچوں کی تعلیم اور تربیت پر ان کی ہمیشہ گہری نظر رہتی ہے۔ بچے ارد گرد کے ماحول سے کس طرح اور کیا سیکھ رہے ہیں؟ ان کی تربیت میں معاشرہ مثبت انداز میں اپنی ذمہ داریاں ٹھیک طور پر پوری کر رہا ہے یا نہیں؟ بچوں کی روزمرہ زندگی میں ان کے گرد و پیش پائے جانے والی معاشرتی ناہمواریوں اور منفی رویوں کا ان پر کس قدر بُرا اور خطرناک اثر پڑتا ہے اس سے وہ اوائل عمری سے ہی بخوبی آگاہ ہیں اور اپنی تحریروں کے ذریعے اس کے خلاف ہمیشہ اپنی آواز بلند کرتی رہی ہیں۔ انھی موضوعات پر مقامی اور قومی اخبارات کی زینت بننے والے ان کے کالموں کا مجموعہ ''دستکِ درِ مقفل'' ان کی پہلی تصنیفی کاوش ہے۔

عبدالکریم خالد

سابق وائس چانسلر، ایجوکیشن یونیورسٹی، لاہور

مصنفہ کے بارے میں !

نام : کنیز بتول کھوکھر

والد کا نام : حاجی محمد علی

جائے پیدائش : موضع نوشہرہ کھوکھراں ضلع سرگودھا

تعلیم : ایم اے (اردو)، بی ایڈ

پیشہ: درس وتدریس

ادبی سفر کا آغاز : 1996 میں شاعری سے آغاز کیا۔

ادبی شناخت : خاموش گفتگو اور مختلف اخبارات میں کالموں کی باقاعدہ اشاعت

Retail Price
400.00

urdusukhan@hotmail.com
nasirmalik.01@gmail.com
https://twitter.com/urdusukhan
https://www.facebook.com/urdusukhancom-136555273080951/

ISBN
9 789697 430161 >

www.urdusukhan.com
ART LAND, Chowk Azam. Distt. Layyah (Punjab) Pakistan